البلاغ
سرپرست:
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

هذا بلاغ للناس

•

دار العلوم کراچی کا ترجمان

ماہنامہ

البلاغ

مدیر اعلیٰ:

محمد تقی عثمانی

مدیر انتظامی:

خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

محرم الحرام ۱۳۸۹ھ ـــــ اپریل ۱۹۶۹ء

جلد: ۳ - شمارہ: ۱

فی پرچہ ـــــــ ۷۵/ پیسے

سالانہ ـــــــ آٹھ روپے

غیر ممالک سے ـــــــ ایک پونڈ

بذریعہ ہوائی ڈاک ـــــــ دو پونڈ

مشرقی پاکستان ہوائی ڈاک سے: ساڑھے نو روپے

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:

مولانا ظہور الحسن صاحب، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر۔ (بھارت)

ڈاک کا پتہ:

البلاغ۔ دارالعلوم کراچی: ۱۴

سرورق: ـــــــ سلطان احمد

مطبوعہ: مشہور آفسٹ پریس کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکر و فکر

حمد و ستائش اُس ذات کے لئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا!

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنھوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

پچھلے دنوں مُلک جس سنگین بحران سے گذرا ہے، گذشتہ اکیس سال میں ایسا سخت بحران کبھی نہیں آیا تھا، ان دنوں اصلاحِ حال کی پر خلوص کوششوں کے ساتھ جبر و تشدد اور شر انگیزی کا بازار بھی خوب گرم رہا۔ شر پسندوں کو کھُل کھیلنے کا پورا موقع مِلا، اور اس کے نتیجے میں نہ جانے کتنے خاندان ویران ہو گئے، کتنی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں، قوم کی کتنی دولت ہنگاموں کی نذر ہو گئی، اور کچھ عرصے کے لئے پُورا ملک بدامنی اور بے چینی کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ کچھ دنوں سے حالات میں تبدیلی ہوئی ہے اور رفتہ رفتہ قوم کے مستقبل کا فیصلہ لاٹھی پتھر کے بجائے ذہن و دماغ کے ہاتھ میں آ رہا ہے۔ گزشتہ دو تین ماہ میں حالات نے جس ڈرامائی انداز میں پلٹے کھائے ہیں، اس کے پیشِ نظر ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس وقت یہ سطور قارئین کے سامنے پہنچیں گی اس وقت ہوا کا رُخ کیا ہو گا۔ لیکن جو صورتحال اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کی روشنی میں تو یہی توقع ہو چلی ہے کہ انشاء اللہ افہام و تفہیم کے ذریعہ فضا کا وہ تکدر رفع ہو جائیگا جس نے ملک کے ہر باشندے کو بے چین کیا ہوا تھا۔

دُنیا کے ہر واقعے میں انسان کے لئے عبرت کے بہت سے سبق ہوتے ہیں، اور اگر انسان ان پر کما حقہٗ توجہ دے تو اسکی زندگی کا سنگین سے سنگین حادثہ بھی اس کی آئندہ زندگی کے لئے ایک رحمت بن سکتا ہے۔ حالیہ بحران بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اس لئے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ملک کے اس سنگین بحران سے وہ سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں جو قدرت نے ہمیں دئے ہیں۔

گزشتہ چند ماہ کے واقعات نے ہمیں سب سے اہم سبق تو یہ دیا ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ کتنی مستحکم کیوں نہ ہو

عوام کی مرضی کے خلاف زیادہ دیر تک اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتی، جبر و اکراہ ایک مختصر عرصے کے لئے کسی قوم کی زبان بند کر سکتا ہے، لیکن اس طرح حکومت اور عوام کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جس کی موجودگی میں کوئی صحت مند معاشرہ تعمیر نہیں ہو سکتا اور پھر رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آہی جاتا ہے جب اندر ہی اندر پکنے والا لاوہ پھوٹ ہی پڑتا ہے اور اس کے نتائج صرف حکومت ہی کے لئے نہیں پوری قوم کے لئے بڑے ہولناک ہوتے ہیں۔ وہ جھنجھلاہٹ اور غصہ جو سالہا سال تک دل ہی دل میں گھٹتا رہا ہو، جب اچانک باہر آتا ہے تو کبھی اعتدال کی حدود میں نہیں رہا کرتا۔ اسے معقولیت کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس کی لپیٹ میں صرف ظالم نہیں مظلوم بھی آجاتا ہے اور حکومت اور عوام کی یہ رسہ کشی پوری قوم کیلئے انتہائی مہلک ثابت ہوتی ہے۔

مستقبل میں ملک کی باگ ڈور خواہ کسی کے ہاتھ میں آئے، حالیہ بحران سے ملنے والا یہ عظیم سبق اسے ہر آن سامنے رکھنا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور سبق ہمیں موجودہ صورتِ حال سے حاصل ہوتا ہے جو اہمیت کے اعتبار سے پہلے سے زیادہ عظیم ہے ــــــ انگریز اپنے دو سو سالہ دورِ حکومت میں عملاً ہمکو یہ بات سکھلا گیا تھا کہ حکومت پر کی جانے والی صرف وہی تنقید موثر ہو سکتی ہے جو اپنے ساتھ جلسے جلوس مظاہرے اور ایجی ٹیشن، سیاہ جھنڈیاں اور گندے انڈے لیکر آئی ہو اس کے بغیر ایوانِ اقتدار میں کوئی مطالبہ قابلِ سماعت نہیں ہوتا، ضرورت تو اس بات کی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم اس بیمار طرزِ فکر کو ختم کر کے ایسا ماحول پیدا کرتے جسمیں سنجیدہ اور معقول تنقید کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی ہو اور جسمیں عوام کو یہ اطمینان ہو کہ جو شکایت ٹھنڈے انداز میں نرم لب و لہجہ کے ساتھ کی جائیگی وہ حکومت کے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہوگی اور اس پر نتائج جلد مرتب ہونگے۔

لیکن اب تک ہوتا یہ رہا ہے کہ کسی عوامی مطالبہ کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا گیا جب تک وہ شور اور ہنگامے کیساتھ نہ کیا گیا ہو۔ خاص طور سے گذشتہ دس سال کی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھئے جن عوامی مطالبات کو آج بعد از خرابی بسیار مان لیا گیا ہے گذشتہ دس سالوں میں یہ مطالبے عوام کی طرف سے بار بار دہرائے گئے۔ تقریر و تحریر کے پر امن اور سنجیدہ ذرائع سے حکومت پر بار بار یہ واضح کر دیا گیا کہ عوام کیا چاہتے ہیں، پریس اپنی ہزار پابندیوں کے باوجود تعمیری تنقید کرتا ہی رہا لیکن جبتک ان مطالبات کے ساتھ ایجی ٹیشن کی فضا پیدا نہیں ہوئی، اس وقت تک حکومت نے انھیں در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس قسم کی تنقید کرنے والوں کو ہمیشہ "شرپسند" "تخریب کار" اور "رجعت پسند" جیسے القابات سے نوازا جاتا رہا۔ حکومت نے ان کی طرف توجہ اس وقت کی جب نوبت ہڑتالوں تک پہنچ گئی، بر سر عام دشنام طرازی ہونے لگی۔ اور مظاہروں نے جھگڑے فساد کی شکل اختیار کر لی۔

اس طرزِ عمل کے صرف دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں، یا تو ملک کا سنجیدہ، پڑھا لکھا اور متوازن الفکر طبقہ مایوس ہو کر ملک کے مسائل میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دے اور ہمیشہ بات صرف ان جذباتی مستقل مزاج اور انتہا پسند لوگوں کی چلا کرے جو شور و شغب، توڑ پھوڑ اور غنڈہ گردی میں طاق ہوں یا پھر ملک کا سنجیدہ طبقہ بھی مجبور ہو کر ایجی ٹیشن کے میدان میں آئے اور لنگوٹ کس کر گالیوں اور گولیوں کی فضا پیدا کرے۔ تاکہ حکومت کے ایوانوں میں اس کی آواز کو آواز سمجھا جا سکے ــــــ سوچنے کی بات ہے کہ کیا اس طرح ملک کو کبھی سکھ چین نصیب ہو سکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ملک میں پائیدار امن اور چین اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک حکومت کی جانب سے تعمیری تنقید کی پوری پوری حوصلہ افزائی نہ ہو، عوام کو ہر قیمت پر یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ انھیں اپنے جائز مطالبات منوانے کے لئے ہاتھوں میں پتھر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو حکومت خود ہی ان کے دُکھ درد کو جاننے اور سمجھنے کی پوری کوشش کرتی ہے اور اگر کسی معقول بات کی طرف اس کا ذہن متوجہ نہ ہو سکے تو اسے متوجہ کرنے کے لئے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین اور مراسلے اور بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ اگر عوام کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو تو ان کے دل میں شدید جھنجھلاہٹ پیدا ہونا لازمی ہے اور دلوں میں یہ جھنجھلاہٹ پیدا کر دینے کے بعد یہ شکایت بالکل فضول ہے کہ عوام ایجی ٹیشن کے دوران معقولیت کی حدود پر قائم نہیں رہے۔

بہر کیف! جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب ملک کی تاریخ کا ایک نیا دور ہمارے سامنے ہے۔ صدر مملکت نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لینگے، بظاہر بالغ رائے دہی کا مطالبہ بھی اب تسلیم کر لیا جائیگا ان حالات میں تمام تر ذمہ داری عوام کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اب ملک کے مستقبل کا فیصلہ انہی کو کرنا ہے۔ اور اگر عوام نے اس موقع پر پوری سوجھ بوجھ، بیدار مغزی اور اجتماعی شعور کا مظاہرہ نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ حالات کہیں پہلے سے زیادہ خراب نہ ہو جائیں۔

حزب اختلاف کی مختلف الخیال جماعتیں اب تک صرف موجودہ حکومت کی نفی پر متحد ہوئی تھیں، مثبت پروگرام کے معاملے میں ان پارٹیوں کے درمیان شدید اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے، اسلام کا نام لینے میں تو ہر جماعت اپنا فائدہ ہی محسوس کرتی ہے لیکن عملاً اکثریت ان جماعتوں کی ہے جو یا امریکہ کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہیں، یا روس اور چین کو، انتخابات کے موقع پر حزب اختلاف کے ان دو کیمپوں کے درمیان یقیناً شدید رسہ کشی ہو گی اور پاکستان بھی دائیں اور بائیں بازو کی لڑائی کا مرکز بن جائے گا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی عوام کی حقیقی مرضی نہ امریکی بلاک کے ساتھ وابستہ ہونے میں ہے نہ روس یا چین کے ساتھ، ان کی اصل آرزو "اسلام" اور خالص "اسلام" ہے جس میں نہ سرمایہ داری کی آمیزش ہو نہ اشتراکیت کی۔ اسلام کو عملاً نافذ کرنے کی آرزو ان کے دلوں میں سالہاسال سے موجزن ہے، اسی آرزو نے ان سے ہزارہا قربانیاں دلوا کر پاکستان بنوایا تھا انھوں نے تقسیم ملک کے وقت اپنی جان، مال، اور آبرو کی متاع صرف اس لئے نثار کی تھی کہ وہ ایک آزاد خطۂ زمین میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام زندگی برپا کرنا چاہتے تھے، اور آج بھی اگر ان کے دل میں اجتماعی سطح پر کوئی جذبہ بیتابی کے ساتھ امڈ آتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی طرح پاکستان میں "اسلامی مملکت" کا حسین خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔

امریکہ نواز سیاسی جماعتیں ہوں یا اشتراکیت پسند حلقے، پاکستانی عوام کی اس دلی خواہش کو خوب جانتے ہیں، اسلئے وہ زبان سے کبھی یہ نہیں کہتے کہ انھیں اسلام کا نظام زندگی پسند نہیں ہے، اس کے بجائے وہ ہر مرحلے پر نام اسلام ہی کا استعمال کرتے ہیں، وہ سرمایہ دارانہ نظام کو اس ملک پر مسلط کریں گے تو یہی کہہ کر کریں گے کہ یہ عین اسلام ہے اور اشتراکیت کو عوام پر ٹھونسیں

گے تو بھی کہہ کر ٹھونسیں گے کہ یہ "اسلامی سوشلزم" ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کا نام لئے بغیر اس قوم کے دل نہیں جیتے جا سکتے۔

ان حالات میں عوام کی ذمہ داری بہت نازک ہوگئی ہے، اگر ہم واقعۃً یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام رُوبہ عمل آئے تو ہمیں صرف نعروں کے پیچھے چل پڑنے کی عادت چھوڑنی ہوگی۔ جب یہ بات کھُل کر سامنے آچکی ہے کہ اس ملک میں کفر والحاد کی دعوت بھی اسلام ہی کے نام سے دی جاتی ہے تو ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ کسی جماعت یا کسی فرد کے پیچھے لگنے کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس کے دئے ہوئے نعروں میں سے ایک نعرہ اسلام بھی ہے، اس کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام کا یہ نام اپنے پیچھے کچھ حقیقت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اس بات کا امتحان کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اپنا مخصوص نظامِ فکر و عمل رکھتا ہے۔ اسے کسی بھی مرحلہ پر اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دنیا کے کسی چلتے ہوئے نظام سے کچھ نظریات کی بھیک مانگ کر اپنا کام چلائے۔ لہٰذا سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، ان میں سے کسی بھی نظام کے ساتھ اس کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ اور جو شخص ایسا پیوند لگانے کی کوشش کرتا ہے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ یا تو خود دھوکے میں ہے یا صرف مصلحت کی خاطر اسلام کا نام لیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی نظام کی تفصیلات تو بلاشبہ ایسی ہیں کہ ہر شخص کو ان کا علم نہیں ہوتا لیکن اسلام کے چند موٹے موٹے اصول تو ہر شخص جانتا ہے، ہر مسلمان کو پتہ ہے کہ اسلام میں شراب، زنا، سود، قمار اور رقص و موسیقی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ہر مسلمان کو یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا حکم دیتا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جو جماعت زور و شور کے ساتھ اسلام کا نام لے رہی ہے، اس کے پروگرام اور ذاتی عمل میں اسلام کی اس قسم کی موٹی موٹی چیزوں کا بھی کوئی جز شامل ہے یا نہیں۔ اگر اس کا تفصیلی پروگرام اور اس کے رہنماؤں کا ذاتی عمل ان صاف اور غیر اختلافی چیزوں سے بھی خالی ہے تو اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ اس جماعت کے پیش نظر اسلام کا صرف نام ہی نام ہے، حقیقت اور رُوح نہیں، لہٰذا جو لوگ اس ملک میں اسلام چاہتے ہیں، انھیں اس کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔

یاد رکھئے کہ پاکستان کا مقصدِ وجود "صرف اسلام" ہے۔ آج قدرت نے ہمیں اس ملک کی گاڑی کو صحیح اسلامی خطوط پر رواں کرنے کا بڑا زرّیں موقع دیا ہے۔ اور اگر ہم نے اس موقع پر بیداری کی بجائے غفلت اور سوچ بوجھ کے بجائے سادہ لوحی سے کام لیا تو حالیہ ہنگاموں کا نتیجہ اقتدار کی بے مقصد تبدیلی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ اس تبدیلی کے نتیجے میں اسلامی نقطۂ نظر سے پہلے سے زیادہ بدتر حالات ملک میں پیدا ہوئے تو اس کی تمام تر ذمہ داری عوام پر ہوگی۔ اور ہمارا یہ گناہ قابلِ معافی نہ ہوگا۔

○

اس شمارے سے البلاغ اپنی عمر کی تیسری منزل میں قدم رکھ رہا ہے، دو سال کی مختصر مدت میں اللہ تعالیٰ نے اسے ملت کے ہر طبقے میں جو مقبولیت عطا فرمائی۔ وہ خالص اس کا کرم ہے، ہماری خواہش تو ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ

البلاغ کا ہر شمارہ صوری و معنوی حیثیت سے پہلے سے بڑھ کر ہو لیکن ہمیں افسوس ہے کہ گزشتہ سال کے دوران کتابت و طباعت کے معاملے میں ہم اپنی اس خواہش کو پوری طرح رو بہ عمل نہیں لا سکے۔ لیکن اب اعلان کے مطابق تیسری جلد کا آغاز آفسٹ کے نئے پیرہن میں ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ البلاغ کی یہ نئی پوشاک ہمارے قارئین کو پسند آئے گی اس کے باوجود ہمیں آپ کے مزید مشوروں اور تجاویز کا انتظار رہے گا۔

یہاں ہم پہلی بار اپنے قارئین سے ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ البلاغ کا موجودہ لباس کبھی ہماری امنگوں کی آخری منزل نہیں ہے، ہمارا دل یہ چاہتا ہے کہ خوب سے خوب تر کا یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا رہے لیکن اس کے لئے ہمیں آپ کے سرگرم تعاون کی ضرورت ہے' اب تک البلاغ کاغذ کی شدید گرانی اور قیمت کی کمی کی وجہ سے ہر ماہ کچھ نہ کچھ خسارہ برداشت کرتا رہا ہے۔ اور اب آفسٹ کے اخراجات بڑھ جانے کی وجہ سے اس خسارے میں کچھ اضافہ ہی ہوگا، اگرچہ ان اخراجات کو کسی حد تک پورا کرنے کے لئے قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن طباعت و اشاعت کے کام کا تجربہ رکھنے والے حضرات جانتے ہوں گے کہ محض اس اضافے سے خسارہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہماری تاریخ کے اس نازک موڑ پر البلاغ ملک و ملت کی کوئی مفید خدمت انجام دے تو ہم آپ سے اپیل نہیں مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کے حلقۂ اشاعت کو بڑھانے اور اس کے لئے موزوں اشتہارات فراہم کرنے کی پوری کوشش فرمائیں۔ اگر ہمارے قارئین اپنے اس فریضے کو محسوس فرمائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ البلاغ خسارے سے نجات حاصل کر کے بہت جلد ترقی کی اگلی راہیں تلاش نہ کرے۔

وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

۱۲ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

اُمّتِ محمّدیہ کی خصوصیّت اعتدال

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم اپنی علالت طبع کی وجہ سے اس مرتبہ معارف القرآن کی قسط تحریر نہیں فرما سکے اس لئے سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر پیش خدمت ہے۔ بحمداللہ اب موصوف کی صحت پہلے سے بہتر ہے اور انشاء اللہ آئندہ ماہ سے سورۂ نحل کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔

(ادارہ)

بقرہ رکوع ۱۶:۶، آیت: ۱۴۳

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

(ترجمہ): "اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔"

اس آیت میں امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی ہے۔ اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا جو سب سے افضل و اشرف ہے اسی طرح ہم نے امتِ اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ان کو میدانِ حشر میں یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت دی۔ اس وقت امتِ محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایات ان کو پہنچائیں اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ مدعی علیہم امتیں امتِ محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امت کا تو ہمارے زمانہ میں وجود بھی نہ تھا اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔ تو امتِ محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دیگی کہ بیشک ہم اس وقت موجود نہ تھے مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے اور وہ ان گواہوں کا تزکیہ و

توثیق کریں گے۔ کہ بیشک انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میرے تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی نسائی، مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملاً اور مفصلاً مذکور ہے۔ امتِ محمدیہ کی اصل فضیلت و شرف کا راز یہ بتایا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

(۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہے۔

(۲) وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدارِ فضیلت رکھا گیا ہے۔

(۳) امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رو سے کیا ثبوت ہے۔

ترتیب وار ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے:

(۱) اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا یہ لفظ عدل سے مشتق ہے اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

(۲) وصف اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا ذرا تفصیل طلب ہے۔ اسکو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے۔ دُنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت و علاج کے جاری ہیں طب یونانی، ویدک ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدال مزاج سے ہے اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو وہی بدن انسانی کا مرض ہے۔ خصوصاً طبِ یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے۔ انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم سوداء، صفرا سے مرکب اور انھیں چاروں اخلاط سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں۔ گرمی، ٹھنڈک خشکی اور تری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدن انسانی کی صحت و تندرستی کہلاتی ہے اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے تو ایک حد میں پہنچ کر یہی موت کا پیام ہو جاتا ہے۔

اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیات اور اخلاقیات کی طرف آئیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے اور مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اسی کا نتیجہ روحانی موت ہے۔ اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں کیونکہ ان اجزاء اور کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسان کے شریک بلکہ انسان سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔ جوہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے جس نے اس کو مخدوم کائنات بنایا ہے مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست
آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ؎

اینکہ من بینم خلاف آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت

روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدنِ انسانی کی طرح روحِ انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے اور جس طرح بدن کی صحت اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے اسی طرح روح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے۔ اس لئے انسان کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو۔ یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوا اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا اس لئے انسانِ کامل کے اولین مصداق آپ ہی ہیں۔

جس طرح انسانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بقدر ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورہ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس۔

"یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دیکر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں اور ہم نے اتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔"

اسمیں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنیکی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور عملی اعتدال پیدا کریں۔ کتاب اخلاقی اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی اور ترازو معاملات لین دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ اور عدل و انصاف قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپنے سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنیکی اصلی غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے اور یہی قوموں کی صحتمندی اور تندرستی ہے۔ اسی بیان سے آپنے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی ہے کہ وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا یعنی ہم نے تمھیں ایک معتدل امت بنایا ہے۔ یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں اُمتِ محمدیہ کو امتِ وسط یعنی معتدل امت فرما کر یہ بتلادیا کہ انسان کا جوہر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے اور جس غرض کے لئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام قائم ہے اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئیں ہیں یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس اُمت کے متعلق اس خاص وصفِ فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے۔ سورۂ اعراف کے آخر میں امتِ محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:

وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون۔

"یعنی ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک ایسی امت ہے جو سچی راہ بتلاتے

ہیں اور اسی کے موافق انصاف کرتے ھیں"۔

اس میں اُمتِ محمدیہ کے اعتدال روحانی و اخلاقی کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں جس میں کسی قوم یا شخص کے خصوصی مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورہ آل عمران میں امتِ محمدیہ کے اسی اعتدال مزاج اور اعتدال روحانی کے آثار کا بیان ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔

یعنی: تم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہیں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی اسی طرح ان کو قوموں کو صحت مند مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانہ پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں سے بہتر اُمت قرار پائی ہے۔ اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دئے گئے ہیں۔ ایمان عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گی وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوں گی بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو گا۔ گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جس طرح ممکن ہو انھیں جنّت کے دروازوں پر لا کھڑا کرے۔ اخرجت للناس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اُمت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الدین النصیحۃ کا یہی مطلب ہے کہ دین اس کا نام ہے کہ سب مسلمانوں کی خیر خواہی کرے۔ بُرے کاموں میں کفر شرک، بدعات، رسوم قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں۔ ان سے روکنا بھی کئی طرح ہو گا کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے کبھی قلم سے کبھی تلوار سے۔ غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہو گیا۔ یہ صفت جس قدر عموم و اہتمام سے امتِ محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(۳) اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس اُمت کے توسط و اعتدال کے واقعات سے ثبوت کیا ہے۔ اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال، اخلاق اور کارناموں سے موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے۔ اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال:

سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے تو پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسول کو اسکا بیٹا بنا لیا اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے قالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللہ۔ اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب ان کا رسول ان کو کسی جنگ و جہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون یعنی جائیے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذائیں پہنچا رہے ہیں۔ بخلاف امتِ محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن ہر

زمانہ میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال، اولاد اور آبرو سب کو قربان کردیتے ہیں ؎

سلام اس پر کہ جسکے نام لیوا ہر زمانہ میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانہ میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باہمہ کمالات و فضائل عبداللہ ورسولہ مانتے اور کہتے ہیں۔ وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ پیمانہ رکھتے ہیں جو قصیدہ بردہ میں فرمایا ہے ؎

دع ما ادعتہ النصاریٰ فی نبیھم
واحکم بما شئت مدحا فیہ واحتکم

یعنی اس کلمۂ کفر کو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہدیا کہ وہ معاذ اللہ خود خدا یا خدا کے بیٹے ہیں اس کے سوا آپکی مدح وثنا میں جو کچھ کہو وہ سب حق وصحیح ہے جسکا خلاصہ کسی نے ایک مصرعہ میں اس طرح بیان کردیا ہے ؏

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال:

اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے اس میں ملاحظہ فرمایئے پچھلی اُمتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے رشوتیں لے کر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے یا غلط فتوے دیے جاتے ہیں اور طرح طرح کے حیلے بہانے کرکے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپکو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنھوں نے ترک دنیا کرکے رہبانیت اختیار کرلی۔ وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپکو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔ امت محمدیہ نے اس کے خلاف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے کے مالک بنکر دنیا کو یہ دکھلادیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں بیر نہیں۔ مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اسکی حکمرانی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے۔ اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی۔ اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد
ز تدبیر عبید اللہی آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال:

اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے تو پچھلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں۔ حق و ناحق کی کوئی بحث نہیں اپنی اغراض کیخلاف جس کو دیکھا اسکو کچل ڈالا، قتل کردیا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے۔ ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا اور وہاں کچھ نقصان کردیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بسوس سو سال تک مسلسل جاری رہی۔ ہزاروں انسانوں کا خون ہُوا۔ عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کردینے کی رسم تھی کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ ان کو ستی کرکے جلا ڈالنے کا رواج تھا۔

اسکے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیہانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑوں کی ہتیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کی ذبیحہ کو حرام قرار دیں خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اُٹھانے کو ظلم سمجھیں۔ اُمت محمدیہ اور اسکی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا۔ ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے اور نہ صرف صلح و آشتی کے وقت بلکہ عین میدان جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے۔ اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا اپنے حقوق کے معاملہ میں درگذر اور عفو و چشم پوشی کا سبق سکھلایا۔ دوسروں

کے حقوق کا پورا احترام کرنے کے آداب بتائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال:

دُنیا کی ہر قوم وملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے۔ اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں نظر آئیں گی۔ ایک طرف نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں حلال وحرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوشحالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کرکے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلینا ہی سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دے دیا جاتا ہے اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال ودولت کی پرستش اور اس کو مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔ امتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب وغریب صورت پیدا کی کہ ایک طرف تو دولت کو مقصدِ زندگی بنانے سے منع فرمایا اور اس پر کسی منصب وعہدہ کا مدار نہیں رکھا اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے۔ قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا۔ مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا۔ حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے اسکی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان کو چاہتی ہے اس وقت بطورِ مثال چند نمونے اعتدال وبے اعتدالی کے پیش کرنا تھے اور اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہوگیا کہ امتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

"اگر امریکا اور رُوس کے
وزرائے فینانس تعصب سے بالا ہو سکیں تو وہ
قمری سال ہی محصول کی وصولی کیلئے رائج کرلیں!"

سالِ نو

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

حرکت میں برکت ہے۔ یہ معلوم کر کے حیرت تو نہیں، مسرت ہی مسرت ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے ماہنامہ البلاغ روز افزوں ترقی پذیر ہے اور سالِ نو سے اس کا ایک بہتر اور جدید تر دور شروع ہو رہا ہے۔ بارک اللہ فی مساعیکم۔

سالِ نو کے لفظ سے ذہن وقت کے مفہوم اور سنہ ہجری کی تاریخ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اسی پر کچھ الفاظ لکھ کر سعادت اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن اولاً ایک تقریب کی طرف توجہ دلانا نامناسب نہ ہوگا۔

امام محمد کی بارہ سو سالہ تقریب:

اب سنہ ۱۳۸۹ھ شروع ہو رہا ہے۔ اب سے پورے بارہ سو سال پہلے سنہ ۱۸۹ھ میں امام محمد شیبانی کی جو امام ابو حنیفہ کے شاگردِ رشید ہیں، وفات ہوئی۔ اگر پاکستان میں انکی تقریب منائی جا سکے تو نامناسب نہ ہوگا۔ امام احمد بن حنبل نے امام شافعی سے درس لیا۔ امام شافعی کو امام محمد کا تلمذ حاصل رہا۔ اس طرح امام محمد کی یادگار منانا حنفی ہی نہیں شافعی اور حنبلی مذہب والوں کے لئے بھی ایک اخلاقی فریضہ ہے۔

امام محمد جوانا مرگ ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلامی قانون کی اتنی خدمت کی کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ انکی پندرہ بیس تالیفیں ہیں۔ ان میں سے کتاب المبسوط (جسے کتاب الاصل بھی کہتے ہیں)، اب دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں چھپ رہی ہے۔ غالباً دو جلدیں شائع ہوگئی ہیں۔ پوری کتاب کے غالباً چار ہزار صفحے ہوں گے۔ یہ کتاب جسٹی نین کے مجموعۂ قانون سے زیادہ اہم ہے۔ امام محمد خلیفہ ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ کی حیثیت سے خلیفے کے پڑاؤ میں، بمقام رَیّ (تہران) فوت ہوئے اور وہیں دفن بھی ہوئے۔ اہلِ ایران بھی اس تقریب سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ امام محمد کا معاصر یورپ میں شارلمان بادشاہ ہے۔ اس کے زمانے کے علمی کارنامے صفر کے برابر ہیں۔ ہارون رشید اور شارلمان میں وہی فرق ہے جو مثلاً آج ممالک متحدہ امریکہ اور افریقی جنگلوں کے غیر ترقی یافتہ باشندوں میں نظر آتا ہے۔ تلک الایام نداولھا بین الناس۔

وقت کا مفہوم اور سنہ کا آغاز:

سچ پوچھو تو وقت ایک فرضی چیز ہے۔ اگر کوئی شخص کسی تاریک کمرے میں بند ہو یا نابینا ہو، یا فضا پیما اسپوٹنیک میں سوار ہو کر ایسے مقام پر جا رہے جہاں زمین کی گردش سے پیدا ہونے والے طلوع و غروب اسے پیش نہ آتے ہوں۔ اور ہاتھ پر گھڑی بھی نہ ہو۔ تو اس کے لئے وقت ایک ازلی و

ابدی اور نامتناہی چیز کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ اس نامتناہی وقت میں انسان کا وجود اس قطرۂ آب سے زیادہ نہیں جو سمندر کے تلاطم میں کسی موج سے اوپر اچھلے۔ اور ایک دو دقیقے فضا میں گذار کر پھر سمندر ہی میں رل جائے۔

جو بھی ہو کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بابل (عراق) والوں نے ستارہ شناسی (علم ہیئت) سے دلچسپی لی اور ہفتے کے سات دن اور برس کے بارہ مہینے انھیں کی ایجاد ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک خاص مدت کے بعد گرمی سردی وغیرہ موسم کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس اعادے کی مدت کو انھوں نے ایک سال قرار دیا اور نئے چاند کے اعادے کو مہینہ۔ پھر دیکھا کہ بارہ مہینوں میں سارے موسم ختم ہو کر ان کا اعادہ ہونے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ اہل علم نے مشاہدوں سے یہ بھی محسوس کیا کہ بارہ قمری مہینوں کے کبھی ۳۵۴، اور کبھی ۳۵۵ دن ہوتے ہیں۔ لیکن سال یا موسم کا اعادہ ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن میں ہوتا ہے۔ (آسمان کے بعض ستاروں یعنی بروج کا مقام بھی اسی مدت میں اعادہ پاتا ہے) عام دینی و دنیوی ضرورتوں کے لئے تو قمری سال مفید تھا، لیکن زراعت کے لئے موسمی سال کی ضرورت تھی۔ اس کا حل بابل والوں نے یہ کیا کہ قمری سال میں کبیسہ گری کی جائے۔

قمری گردش اور موسمی گردش میں ہر سال دس سے بارہ دن تک کا فرق ہوتا ہے۔ اس طرح ہر تین سال میں ایک مہینے سے ذرا زیادہ فرق ہوتا ہے۔ اس لئے کبیسہ کرنے کے لئے ہر تیسرے سال بارہ کی جگہ تیرہ مہینے کا سال قرار دیا جاتا اور جو تھوڑی سی زائد زیادتی تھی وہ تیس سال میں ایک مزید مہینے کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس لئے تیس سال کے اختتام پر ایک مزید ماہ کا جنتری میں اضافہ ہوتا۔ یعنی تیسواں سال بھی (سہ سالہ زیادتی کے ذریعے سے) تیرہ مہینوں والا ہوتا۔ اور اکتیسواں سال بھی (سی سالہ زیادتی کے لئے) تیرہ مہینوں والا ہوتا۔ پھر نئے دور کے سلسلے میں تینتیسواں سال، چھتیسواں سال وغیرہ بھی تیرہ مہینوں کے ہوتے۔ یہ بابلی اصول تھا، جو اب وہاں کی کھدائیوں اور کتبات کی خواندگی کے باعث ثابت ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل ہی سے آئے تھے۔ اور اپنے کنبے (حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل) کو مکے میں بسا کر مکے میں حج کا آغاز فرمایا تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ حج کو ہمیشہ ایک معین موسم (مثلاً بہار میں) لانے کے لئے اپنے وطن کی تقویم اور کبیسہ گری ہی کو رائج کیا ہو زمانۂ جاہلیت میں یہی نظام مکہ میں رائج رہا ہو گا اور حجۃ الوداع میں وحی کی اساس پر اور احکام خداوندی کے تحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض عظیم تر و مفید تر سماجی ضرورتوں سے کبیسہ گری کو منسوخ فرما دیا۔ الحمد للہ اولہ و آخرہ۔

(یہ کہتا چلوں کہ تیس سال میں دس نہیں بلکہ گیارہ مرتبہ کبیسہ کرنے کو دو طرح سے انجام دیا جا سکتا ہے آسان طریقہ وہ ہے جو بابل میں رائج تھا۔ اس میں ہر تیسرا سال نیز تیسواں، اکتیسواں تینتیسواں ۳۳ اور چھتیسواں ۳۶ سال تیرہ مہینوں والے ہوتے۔ یعنی کبھی سال بہ سال [= ۳۰-۳۱] کبھی ہر دو سال میں ایک بار [= ۳۱-۳۳] اور کبھی تین سال میں ایک بار [= ۳۳-۳۶] کبیسہ کیا جاتا۔ لیکن ایک زیادہ پیچیدہ طریقہ ہیئتی ریاضیات نے یہ نکالا کہ تیس ۳۰ سال کے اندر ہی گیارہ مرتبہ کبیسہ کیا جائے اور اکتیسویں سال مکرر کبیسہ کرنے کی ضرورت نہ رہے [یعنی ۳-۶-۹-۱۱-۱۴-۱۷-۱۹-۲۰-۲۲-۲۵-۲۸-۳۰ ویں سال کبیسہ گری ہوتا۔ البیرونی کے زمانے میں بابلی کھدائیاں نہیں ہوئی تھیں لیکن فلکی ریاضیات ترقی کر گئی تھی۔ اس لئے اس نے زمانۂ جاہلیت کے مکی نظام کو وہ فرض کر لیا ہے جو اس کی رائے میں ہونا چاہئے تھا نہ کہ وہ جو واقعتاً ہوتا تھا۔ البیرونی نے اپنے مفروضے کی تائید میں کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے میں اسے اس لئے غلط سمجھتا ہوں کہ عہد نبوی کے حجۃ الوداع سے قبل کے واقعات بابلی تقویم کی اساس پر ٹھیک بیٹھتے معلوم ہوتے ہیں، البیرونی کے اصول پر نہیں)

جو بھی ہو، مشرکین کی ایذا رسانی پر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو عرب کے عام رواج پر عمل ہوا یعنی مسلمان وقت شماری اپنی دینی زندگی کے اس اہم واقعہ سے

کرنے لگے۔ اور اس کا ثبوت ہے کہ اس کا آغاز عہد نبوی ہی میں اور ہجرت کے فوراً بعد شروع ہو گیا لیکن جیسا کہ امام بیہقی نے اپنی دلائل النبوہ (مخطوطے) میں صراحت کی ہے، صحابۂ کرام کا یہ طرز عمل یکساں نہ تھا۔ بعض لوگ اسے اس سال کے محرم سے آغاز کرنے لگے جس میں آخری بیعتِ عقبہ ہوئی اور ہجرت کا آغاز ہوا۔ بعض اس محرم سے سال شمار کرنے لگے جس کے دوران میں ماہ ربیع الاول میں خود رسول اکرمؐ نے ہجرت فرمائی، اور بعض اس محرم سے جو رسولِ اکرم کی تشریف آوری کے بعد پہلی مرتبہ آیا۔ (ایک سنہ ہجری سے ایک سال پہلے شروع ہوتا، دوسرا سنہ ہجری کے مطابق ہوتا، اور تیسرا سنہ ہجری کے ایک سال بعد سے آغاز ہوتا۔) اسی پیچیدگی کو دور کرنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ۱۷ھ میں سرکاری طور پر یہ حکم دیا گیا کہ طریقہ دوم پر عمل ہو یعنی اسلامی سال اس محرم سے شروع ہو جس کے دو ڈھائی مہینے بعد رسول اکرم روحنا فداہ نے ہجرت اختیار فرمائی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے سنہ ہجری کا غیر سرکاری آغاز ہجرت کے ساتھ ہی، اور سرکاری آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف چھے سال بعد ہو گیا۔ عیسائیوں میں عیسوی سال شارلمان کے زمانے میں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے کوئی سات سو سال بعد رائج ہوا۔

اوپر بیان ہوا کہ حجۃ الوداع (۱۰ھ) کے موقع پر ایک وحی کے باعث نسی (کبیسہ گری) منسوخ کر دی گئی۔ اس کے بے شمار فائدوں میں سے صرف دو کا، جو عام فہم ہیں (کلمہ الناس علی قدر عقولہم) یہاں ذکر کروں گا:

(۱) عہد نبوی میں سرکاری محاصل زراعت پر تو فصل کٹنے پر اور باقی چیزوں (تجارت، جانوروں کے ریوڑ، کان کنی وغیرہ) پر قمری سال پر وصول کئے جاتے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قمری سال موسمی سال سے چھوٹا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قمری تقویم پر رعایا اگر (۳۳) مرتبہ سالانہ محصول ادا کرتی ہے تو موسمی یا شمسی سال والے صرف (۳۲) مرتبہ محصول ادا کرتے ہیں۔ کون سا وزیر فینانس ہو گا جو اس خداداد موقع سے فائدہ اٹھا کر سرکاری آمدنی میں اضافے کی کوشش نہ کرے؟ چند ماہ ہوئے فرانس کے مستشرقین کے ایک مشہور و ممتاز رسالے میں یہ الفاظ لکھے نظر آئے:

"اگر امریکا اور روس کے وزراء فینانس تعصب سے بالا ہو سکیں تو وہ اسلامی قمری سال ہی محصول کی وصولی کے لئے رائج کر لیں"۔

اس میں شک نہیں کہ تنخواہیں بھی قمری ماہ کے حساب سے دینی پڑیں گی، لیکن اس کے باوجود حکومت کی آمدنی میں کبیسہ گری کی منسوخی سے خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور رعایا کو وہ بار ہونا تو کیا محسوس بھی نہیں ہوتا۔

(۲) دوسرا فائدہ یہ ہے کہ روزہ اور حج جیسی عبادتوں کو ہر موسم میں لایا جا سکتا ہے تاکہ اس کی عادت رہے اور سردی گرمی ہر زمانے میں بھوک پیاس برداشت کر سکنے اور سفر کر سکنے سے مثلاً جو جنگی فائدے ہوتے ہیں ان کا اہتمام ہو جائے۔ نپولین کہا کرتا تھا: "کاش میرے پاس مسلمان فوج ہوتی تو میں ساری دنیا فتح کر لیتا"۔ اس کا اشارہ اسی چیز کی طرف تھا کہ مسلمان سپاہی ہر موسم میں روزہ رکھنے کا عادی ہوتا ہے اور سارا دن بھوکا پیاسا رہ کر بھی جنگ کر سکتا اور تراویح کے باعث رات میں بھی جنگ کو جاری رکھ سکتا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ عہد نبوی کے واقعات کو عیسوی سنہ کے معادل تاریخوں میں معلوم کرنا چاہیں تو مکے میں بابلی تقویم کے رواج کو فرض کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس پر ایک تفصیلی مضمون کراچی کے موقر رسالے "جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے[1]۔ اس کے مطابق ولادتِ مبارک ۱۲ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجرت مطابق ۱۷ جون ۵۶۹ء دوشنبہ کو ہوئی۔ اسکی فرنگی حساب سے چودہ سو سالہ سالگرہ اب قریب میں آ رہی ہے۔ اور ہجرت ۱۲ ربیع الاول ۱ھ مطابق ۳۱ مئی ۶۲۲ء روز دوشنبہ کو۔

● وما أبرئ نفسي إن النفس لأمارة بالسوء

[1] ملاحظہ ہو جنوری نمبر ص: ۱ تا ۱۸، نیز اکتوبر نمبر ص ۲۱۳ تا ۲۱۹۔ مضمون کی پہلی قسط میں کچھ غلطیاں ہو گئی تھیں جن کی قسط دوم میں تصحیح کر دی گئی ہے۔ اس مذکورہ مضمون میں عہد نبوی کے نہ صرف دیگر اہم واقعات کی معادل فرنگی تاریخیں بتائی گئی ہیں بلکہ اس نتیجے پر پہنچنے کے ریاضیاتی اصول اور حوالے بھی بیان ہوئے ہیں۔

محمد تقی عثمانی

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

چند سال پہلے جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جو کتاب "خلافت و ملوکیت" کے نام سے شائع ہوئی ہے اسکے بارے میں البلاغ کے اجرار کے وقت سے ہمارے پاس خطوط کا تانتا بندھا رہا ہے، ملک و بیرون ملک سے مختلف حضرات اس کتاب کے بارے میں ہمارا موقف پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ اب تک ہم نے اس موضوع پر دو وجہ سے کچھ شائع کرنے سے گریز کیا تھا ایک وجہ تو یہ ہے کہ البلاغ کا بنیادی مقصد اس قسم کی بحثوں سے میل نہیں کھاتا۔ ہماری کوشش روز اول سے یہ رہی ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی یہی رہے گی کہ البلاغ کی تمام تر توجہ اُن بنیادی مسائل کی طرف رکھی جائے جو بحیثیت مجموعی پوری اُمتِ مسلمہ کو درپیش ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ "خلافت و ملوکیت" کا جو حصہ اسوقت سوالات اور اعتراضات کا محور بنا ہوا ہے، وہ ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہے جسے بحث و تحیص کا موضوع بنانا بہ حالاتِ موجودہ ہم کسی کے لئے بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد اُن سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ ہیں کہ زمین و آسمان کی نگاہوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد اُن سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ انسان نہیں دیکھے۔ حق و صداقت کے اس مقدس قافلے کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنیسے عاجز ہے۔ اور اگر کسی سے کبھی کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما کر اُن کے جنتی ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ ان کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا؟ اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہے:

تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون

یہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی۔ انکے اعمال انکے لئے اور تمھارے اعمال تمھارے لئے، اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیسا عمل کیا تھا؟۔

ان دو باتوں کے پیش نظر ہم اب تک نہ صرف اس موضوع پر قلم

اُٹھانے، بلکہ "خلافت وملوکیت" کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز کرتے رہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ فتنہ پوری آب وتاب کے ساتھ کھڑا ہوگیا جس سے بچنے کے لئے ہم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ پچھلے دنوں اس کتاب کے مباحث دینی حلقوں کا موضوعِ بحث بنے رہے۔ اور اسکے موافق ومخالف تحریروں کا ایک انبار لگ گیا۔ ادھر ہمیں اس کتاب کے مطالعے اور اس کے بہت سے قارئین سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ جن حضرات نے اسے عقیدت اور احترام کے ساتھ پڑھا ہے ان کے دل میں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا دور ہونا ضروری ہے، ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ افراط وتفریط سے ہٹ کر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلے کی حقیقت واضح کردیجائے اسی ضرورت کا احساس اس مقالے کی شانِ نزول ہے۔

اس مقالے کو منظرِ عام پر لانے کے لئے ہم نے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا ہے جب کہ اس موضوع پر بحث ومناظرہ کی گرماگرمی دھیمی پڑ رہی ہے۔ اور فریقین کی طرف سے اس کتاب کی حمایت وتردید میں اچھا خاصا مواد سامنے آچکا ہے مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے قارئین کو بحث ومباحثہ کی اس اس فضا سے آزاد ہوکر سوچنے کی دعوت دی جائے جو حقیقت پسندی کے جذبہ کے لئے زہرِ قاتل ہوا کرتی ہے۔

جن حضرات نے خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا ہے، ہمارے اصل مخاطب وہ ہیں، اور ہم نہایت دردمندی کے ساتھ یہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس مقالے کا بحث ومباحثہ کے بجائے افہام وتفہیم کے ماحول میں مطالعہ فرمائیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اگر ان معروضات کو اسی جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو یہ مضمون تطویلِ بحث کا سبب نہیں بنے گا بلکہ انشاء اللہ افتراق وانتشار کی موجودہ کیفیت میں کمی ہی آئے گی۔

---

(۱)
بحث کیوں چھیڑی گئی؟

ہمارے لئے سب سے پہلے تو یہی بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اس پُرفتن دور میں مشاجرات صحابہؓ کی اس بحث کو چھیڑنے کا کیا موقع تھا؟ اُمّتِ مسلمہ کو اس وقت جو بنیادی مسائل درپیش ہیں، اور جتنا بڑا کام اس کے سامنے ہے، مولانا مودودی صاحب یقیناً ہم سے زیادہ اس سے واقف ہوں گے۔ اس اہم کام کے لئے جس یکسوئی اور یک جہتی کی ضرورت ہے، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کون نہیں جانتا کہ آج کی دنیا میں دولت وحکومت پر اور علمی اور فکری مرکزوں پر، ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنے والے نشرواشاعت کے دوررس وسائل پر تمام تر قبضہ یا اُن لوگوں کا ہے جو کھلے طور پر دشمنِ اسلام ہیں اور آپس کے ہزاروں اختلاف کے باوجود اپنا سب سے بڑا خطرہ اسلام کو سمجھتے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلہ میں متحد ہیں یا پھر کچھ ایسے ہاتھوں میں ہے جو مسلمان کہلانے کے باوجود اُن سے ایسے مرعوب ہیں کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ اس کو کھینچ تان کر کسی طرح اُن آقاؤں کی مرضی کے مطابق بنا دیا جائے ان حالات میں اسلام دشمن عناصر کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر کوئی قوت اہلِ حق کے پاس ہے تو وہ صرف ان کا باہمی اتحاد واتفاق اور اجتماعی کوشش ہے۔ اس کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ آپس کے سابقہ اختلافات کو بھی ایک خاص دائرہ میں محدود کرکے ان سب کی پوری طاقت اس محاذ پر صرف ہو جس طرف سے کھلے کفر و الحاد کی یلغار ہے۔ اور کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں ملت کی فکری اور علمی توانائیاں غیر ضروری یا ثانوی اہمیت کے مسائل پر صرف کرنے کے بجائے اُن بنیادی مسائل پر خرچ کی جائیں جو اس وقت عالمِ اسلام کے لئے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔

جہاں تک اسلام کے نظامِ خلافت کی تشریح وتوضیح کا تعلق ہے، بلاشبہ وہ وقت کی بڑی اہم ضرورت تھی اور اس

موضوع پر مولانا نے بھی "خلافت و ملوکیت" کے ابتدائی تین ابواب میں بحیثیت مجموعی بڑی قابلِ قدر کوشش فرمائی ہے۔ لیکن موجودہ وقت کی ضرورت کے لئے اتنا واضح کر دینا بالکل کافی تھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ وہ کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے حدود و اختیار کیا ہوتے ہیں؟ اور راعی اور رعیت کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ — رہی یہ بحث کہ تاریخ اسلام میں خلافت ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہوئی؟ اور اس کی ذمہ داری کس کس پر عائد ہوتی ہے؟ سو یہ خالصۃً ایک ایسی تاریخی بحث ہے جس کی تحقیق ایک علمی نکتہ آفرینی تو کہلا سکتی ہے لیکن اس سے موجودہ کے مسلمانوں کا کوئی قابلِ ذکر فائدہ متعلق نہیں ہے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ یہ موضوع کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر ماضی میں کسی نے بحث نہ کی ہو۔ یا اس کی وجہ سے علمِ تاریخ میں کوئی ناقابلِ برداشت خلا پایا جاتا ہو۔ آج سے کم و بیش پانچ سو سال پہلے علامہ ابن خلدونؒ جیسے عالمگیر شہرت کے مؤرخ نے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے اور اس علمی خلا کو نہایت سلامتِ فکر کے ساتھ پُر کر دیا ہے انھوں نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمے کے تیسرے باب میں خلافت و ملوکیت پر بڑی مبسوط بحث کی ہے، اور اس باب کی چھبیسویں فصل کا تو عنوان ہی یہ ہے کہ:

فی انقلاب الخلافۃ الی الملک[۱]

خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کا بیان

اس فصل میں انھوں نے اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں اس انقلاب کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں، تاریخ اور بالخصوص تاریخ اسلام کے واقعات اور اس کے اتار چڑھاؤ پر ابن خلدونؒ سے زیادہ نظر رکھنے کا دعویٰ اس دور میں شاید ہی کسی کو ہو، انکے افکار کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور تمام مسلمان اور غیر مسلم مؤرخین تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں ان کے مقام بلند کے معترف ہیں اپنی اس بحث میں مشاجراتِ صحابہؓ کے دریائے خون سے وہ نہایت سلامتی کے ساتھ گذر رہے ہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے موجودہ زمانے میں اس مسئلے کی کھود کرید اتنی ہی مضر ہے جتنی بخت نصر کے وقت یہودیوں کی یہ بحث کہ حضرت مسیحؑ کے فضلات پاک تھے یا ناپاک؟ یا تاتاریوں کی یلغار کے وقت اہلِ بغداد کی یہ تحقیق کہ حضرت علیؓ افضل تھے یا حضرت معاویہؓ!

مولانا مودودی صاحب نے اس بحث کو چھیڑنے کی وجہ جواز یہ بیان فرمائی ہے کہ:

> "آج پاکستان میں تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم اسلامی تاریخ اور علمِ سیاست کے متعلق اسلامی نظریات پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ مدت پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے سیاسیات کے امتحان میں یہ سوالات آئے تھے کہ قرآن نے ریاست کے متعلق کیا اصول بیان کئے ہیں؟ عہدِ رسالت میں ان اصولوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا گیا، خلافت کیا چیز تھی اور یہ ادارہ بادشاہی میں کیوں اور کیسے تبدیل ہوا؟ اب کیا معترض حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان طلبہ ان سوالات کے وہ جوابات دیں جو مغربی مصنفین نے دئے ہیں؟ یا ناکافی مطالعہ کے ساتھ خود الٹی سیدھی رائیں قائم کریں؟ یا اُن لوگوں سے دھوکا کھائیں جو تاریخ ہی کو نہیں، اسلام کے تصورِ خلافت تک کو مسخ کر رہے ہیں؟ الخ"[۲]

لیکن ہمارا خیال ہے کہ مولانا جب بحث و مباحثہ کی موجودہ فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو انھیں خود اپنا یہ عذر بہت کمزور محسوس ہوگا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مسلمان طلبہ ان سوالات کے کیا جواب دیں؟ تو اسکا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انھیں وہ جواب دینا چاہئے جو ابنِ خلدونؒ

---

[۱] مقدمہ ابنِ خلدون، باب ۳، فصل ۲۶ ص ۳۶۳ تا ۳۹۱، دار الکتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۵۶ء

[۲] خلافت و ملوکیت۔ ص: ۳۰۰

نے مقدمہ میں دیا ہے اور جس کا ترجمہ ان کے نصاب میں داخل بھی ہے[1]۔ اسے چھوڑ کر مغربی مصنفین یا کسی اور کی طرف وہ اسی وقت رجوع کریں گے جبکہ انھیں از خود بھٹکنے یا گمراہ ہونے کی خواہش ہو اور ظاہر ہے کہ اس خواہش کی موجودگی میں کوئی کتاب انکی مدد نہیں کرسکے گی۔

مولانا کی یہ بات بلاشبہ معقول ہے کہ:

"اگر ہم صحت نقل اور معقول و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان کریں گے اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتب طریقے سے دُنیا کے سامنے پیش نہیں کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھا دیں گے[2]"۔

لیکن ہمیں اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنی ہیں:

(۱) مولانا نے اس فقرے میں دو خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرنے والے اسکے ذریعہ "اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھا دیں گے"۔ دوسرے یہ کہ اس سے خود اسلامی تاریخ کا غلط تصور سامنے آئے گا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے سو اگر یہ لوگ ہماری تاریخ سے ہمارے نظام حکومت اور ہمارے نظام زندگی کا استنباط کرنے کی حماقت کریں گے تو ہمارا صحیح جواب یہ ہوگا کہ ہمارا نظام حکومت اور "ہمارا نظام زندگی" تاریخ کی عام روایات سے نہیں، قرآن سے اور ان احادیث و آثار سے مستنبط ہے جو جرح و تعدیل کی کڑی شرائط پر پوری اترتی ہیں۔ ہمارے نظام زندگی کو سمجھنا ہے تو قرآن و حدیث سے اور فقہ و کلام سے سمجھو، خود مولانا مودودی بھی اس بات کو تسلیم فرماتے ہیں کہ "حرام و حلال فرض و واجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ" اور یہ فیصلہ کہ "دین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے" عام تاریخی روایات سے نہیں ہوسکتا لہٰذا ہمارے لئے آخر یہ کیسے جائز ہوگا کہ اپنے نظام زندگی کے غلط تصور کو ختم کرنے کے لئے ہم خود ان لوگوں کی اس اصولی غلطی کا اعادہ کریں اور اپنے نظام زندگی کا صحیح تصور ثابت کرنے کے لئے ان کی توجہ قرآن و حدیث کی طرف منعطف کرانے کے بجائے خود بھی تاریخی بحثوں میں الجھ جائیں۔؟

رہ گئی دوسری بات کہ اگر ہم نے خود صحتِ نقل کے ساتھ اپنی تاریخ کو مرتب نہ کیا تو یہ لوگ ہماری تاریخ کا نہایت غلط تصور ذہنوں میں بٹھا دیں گے۔ سو یہ بات بلاشبہ بالکل درست ہے اور فی الواقع اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو تحقیق و نظر کی چھلنی میں چھان کر اس طرح مرتب کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے آسکے۔ لیکن اول تو ہم نہایت ادب کے ساتھ یہ گذارش کریں گے کہ مولانا مودودی صاحب نے خود ہماری تاریخ کا جو تصور دے دیا ہے اور ان کی کتاب کے تاریخی حصے سے عہد صحابہؓ و تابعین کا جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے، وہ بجائے خود انتہائی غلط اور خطرناک تاثر ہے، اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تاثر اور کیا دے سکتے ہیں؟ دوسرے مولانا خود ہی غور فرمائیں کیا یہ عظیم کام اتنی آسانی سے عمل میں آسکتا ہے کہ خلافت و ملوکیت کی خالص احکامی بحث کے ضمن میں اس قدر سرسری طور پر اسے انجام دے دیا جائے؟

---

[1] ابن خلدون کا ذکر اس جگہ اسی خصوصیت کیلئے کیا گیا ہے کہ وہ جدید تعلیم گاہوں میں نہ صرف متعارف بلکہ مسلم مورخ ہیں۔ اس موضوع پر تفسیر و حدیث اور علم کلام کی عام کتابوں کے علاوہ ابن عربیؒ کی العواصم من القواصم اور شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء، اور بہت سی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں۔ ۱۲

[2] خلافت و ملوکیت۔ ص: ۳۰۰

اگر ہمیں اپنی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ اصلی شکل میں پیش کر کے دلوں کو اس پر مطمئن کرنا ہے تو محض چند یکطرفہ روایات کو جمع کر دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس کے بجائے ہمیں تحقیق و تنقید کے اصول مدلل طریقے سے معین کرنے ہوں گے، اس کے بعد ہر روایت کے بارے میں معقول دلائل کے ساتھ یہ بتانا ہوگا کہ ہم نے اس کی مخالف روایات کو چھوڑ کر اسے کیوں اختیار کیا ہے؟ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر آپ طبریؒ، ابن کثیرؒ، اور ابن اثیرؒ کے حوالوں سے واقعات کا ایک تسلسل قائم فرما کر دکھلائیں اور "دوسرے لوگ" بعینہٖ انہی کتابوں کے حوالوں سے واقعات کا دوسرا تسلسل ثابت کر دیں تو اس سے وہ "نئی نسل" آخر کیسے مطمئن ہو سکے گی جس کی گمراہی کا آپ کو خوف ہے؟

اسی لئے ہماری رائے یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور خاص طور سے اس کے مشاجراتِ صحابہؓ والے حصے کی تحقیق کا یہ کام یا تو اس پرفتن دور میں چھیڑا نہ جائے کیونکہ امت کے سامنے اس سے زیادہ اہم مسائل ہیں جن کے مقابلے میں یہ کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یا پھر ـــــ انفرادی رائے قائم کرنے کے بجائے متوازن فکر رکھنے والے اہل بصیرت علماء کی ایک جماعت اس کام کو انجام دے۔ اور تاریخ کی تحقیق و تنقید کے اصول طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ علماء کا مشورہ اور تعاون حاصل کرے۔ اس کے بغیر اس سلسلے کی انفرادی کوششیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کو نئے میدان فراہم کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دے سکیں گی۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اسکے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اس معاملے میں ابن خلدونؒ جیسے اہل بصیرت اور متوازن الفکر مؤرخین کی اس تحقیق پر اعتماد کیا جائے جو انھوں نے تاریخ اسلام کے اوّلین ماخذ کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد پیش کی ہے۔ اس موضوع پر اگر کوئی انفرادی کوشش ہو بھی تو وہ اسی تحقیق کو بنیاد بنا کر اسے مزید وسعت دے اور کوئی ایسا نتیجہ نکال کر منظر عام پر نہ لائے جو صدیوں کے مسلّمات کے خلاف ہو جس سے ذہنوں میں خلجان پیدا ہو۔ اور افتراق و انتشار کا دروازہ کھلے۔

اس مختصر گذارش کے بعد اب ہم "خلافت و ملوکیت" کی ان باتوں کی طرف آتے ہیں جو ہماری نگاہ میں سخت قابل اعتراض ہیں۔ قاعدے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم پہلے صحابہ کرامؓ کی عدالت اور تاریخی روایات کی حیثیت سے متعلق اُن اصولی مباحث پر گفتگو کرتے جو مولانا نے اپنے معترضین کے جواب میں چھیڑے ہیں، اس کے بعد جزئیات کی طرف آتے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت وغیرہ کے بارے میں جو اصولی بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں، مولانا مودودی صاحب کی اس کتاب کے بعد وہ شاید اُس وقت تک مولانا کے قارئین کے دلوں میں بیٹھ نہ سکے جب تک مولانا کے بیان کردہ واقعات پر تبصرہ نہ کیا جائے۔ خلافت و ملوکیت کو پڑھنے والوں میں اکثریت ایسے حضرات کی ہوگی جن کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ مولانا کے بیان کردہ ہر واقعے کو اس کے اصل مأخذ میں دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ واقعہ جو تاثر دے رہا ہے وہ فی الواقع صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے بجائے یقیناً بیشتر حضرات نے مولانا مودودی صاحب کی نقل پر اعتماد کر کے اس کتاب سے وہی تاثر لیا ہوگا جو یہ کتاب دے رہی ہے، ایسی حالت میں جب تک ان واقعات کی حقیقت نہ بتائی جائے، عدالتِ صحابہؓ کی بحث "خلافت و ملوکیت" کے ان قارئین کے دلوں میں نہیں اُتر سکے گی جنھوں نے اس کتاب کو عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے ان جزئی واقعات ہی کو سامنے لے آئیں جن پر ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

پوری کتاب پر کما حقہٗ تبصرہ کرنا تو چند در چند وجوہ کی بنا پر ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، ہم یہاں صرف ان اعتراضات کو زیر بحث لائیں گے جو مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کئے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا

ہے، وہ بھی کئی مقامات پر اپنے اسلوب بیان اور کئی جگہوں پر اپنے مواد کے لحاظ سے کچھ کم افسوسناک نہیں ہے، لیکن حضرت معاویہؓ کے بارے میں تو وہ انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور ہماری پرخلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس سے واپس لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے، اسی جذبے کے تحت ہم نے یہاں صرف ان اعتراضات کو اپنی گفتگو کے لئے چُنا ہے جو انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کئے ہیں۔ ہم ایک بار پھر یہ گذارش کریں گے کہ ہماری ان معروضات کو بحث و مباحثہ کی فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھا جائے اور چونکہ معاملہ صحابہ کرامؓ کا ہے اس لئے اس نازک معاملہ میں ذہن کو جماعتی تحزب یا شخصی اعتقاد کی قیود سے بالکل آزاد کرلیا جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ دردمندانہ گذارش قابلِ قبول ہوگی۔

۱۔ بدعت کا الزام

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

"ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی، اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے، اور اس معاملے میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے مختلف خلفائے بنی امیہ کے عہد میں قانون کی پابندی کا کیا حال رہا، اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ کے عہد میں:

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہوگئی تھی۔"

اس "پالیسی" کو ثابت کرنے کے لئے مولانا نے چھ سات واقعات لکھے ہیں، پہلا واقعہ وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ:

"امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے نہ مسلمان کافر کا، حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا، مگر ہشام بن عبدالملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کردیا۔"

(ص: ۱۷۳)

اس واقعہ کے لئے مولانا نے البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۹، اور جلد ۹ صفحہ ۲۳۲ کا حوالہ دیا ہے لہٰذا پہلے اس کتاب کی اصل عبارت ملاحظہ فرمالیجئے:

حدثنی الزہری قال: کان لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وأبی بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ، فلما ولی الخلافۃ معاویۃ ورث المسلم من الکافر ولم یورث الکافر من المسلم، وأخذ بذلک الخلفاء من بعدہ، فلما قام عمر بن عبدالعزیز راجع السنۃ الأولیٰ وتبعہ فی ذلک یزید بن عبدالملک، فلما قام ہشام أخذ بسنۃ الخلفاء یعنی أنہ ورث المسلم من الکافر۔"

"امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہؓ کے عہد میں نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا تھا، نہ کافر مسلمان کا، پھر جب معاویہؓ خلیفہ بنے تو انھوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا، اور کافر کو مسلمان کا وارث نہ بنایا ان کے بعد خلفاء نے بھی یہی معمول رکھا، پھر

جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے پہلی سُنّت کو لوٹا دیا، اور یزید بن عبدالملک نے بھی ان کی اتباع کی، پھر جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سُنّت پر عمل کیا، یعنی مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا۔"[1]

اب اصل صورت حال ملاحظہ فرمائیے، واقعہ اصل میں یہ ہے کہ یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے مختلف فیہ رہا ہے۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، اس اختلاف کی تشریح علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سُنئے:

"وما المسلم فهل يرث من الكافر أم لا، فقالت عامة الصحابة رضى الله تعالى عنهم لا يرث، وبه أخذ علمائنا والشافعیؒ وهذا استحسان والقياس أن يرث وهو قول معاذ بن جبلؓ و معاوية بن ابى سفيانؓ وبه أخذ مسروق والحسن ومحمد بن الحنفية ومحمد بن على بن حسين[2]"

"رہی یہ بات کہ مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے یا نہیں، سو عام صحابہ کرامؓ کا قول تو یہی ہے کہ وہ وارث نہ ہوگا، اور اسی کو ہمارے علماء (حنفیہ) اور امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے لیکن یہ استحسان ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وارث ہو اور یہی حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت معاویہؓ کا مذہب ہے، اور اسی کو مسروقؒ حسنؒ محمد بن حنفیہؒ اور محمد بن علی بن حسینؒ نے اختیار کیا ہے۔"

اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں[3]:

"أخرج ابن ابى شيبة من طريق عبدالله بن معقل قال ما رأيت قضاءً أحسن من قضاء قضى به معاوية نرث أهل الكتاب ولا يرثونا كما يحل النكاح فيهم ولا يحل لهم وبه قال مسروق وسعيد ابن المسيب وابراهيم النخعى واسحاق"

"ابن ابی شیبہؒ نے حضرت عبداللہ بن معقل سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں نے کوئی فیصلہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے بہتر نہیں دیکھا کہ ہم اہل کتاب کے وارث ہوں، اور وہ نہ ہوں، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے لئے ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے، مگر ان کے لئے ہماری عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔ اور یہی مذہب مسروقؒ، سعید بن المسیبؒ، ابراہیم نخعی اور اسحاق رحمہ اللہ کا ہے۔"

پھر حافظ ابن حجرؒ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کی تائید میں ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے:

"عن معاذؓ قال يرث المسلم من الكافر من غير عكس واحتج بأنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول الاسلام يزيد ولا ينقص وهو حديث أخرجه أبو داؤد وصححه الحاكمؒ"

"حضرت معاذؓ فرماتے تھے کہ مسلمان کافر

[1] البداية والنهاية ص ۲۳۲ ج ۹ مطبعة السعادة۔ [2] عمدة القارى ص ۲۶۰ ج ۲۳ ادارة الطباعة المنيرية باب لا يرث المسلم الكافر الخ

[3] فتح البارى ص ۴۱ ج ۱۲ المطبعة البهية مصر ۱۳۴۸ھ باب مذکور

کا وارث ہوگا مگر اس کا عکس نہیں ہوگا،
وہ دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ انھوں نے خود
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا
ہے کہ اسلام (انسانی حقوق میں) زیادتی کرتا
ہے کمی نہیں کرتا۔ یہ حدیث امام ابوداؤدؒ نے
روایت کی ہے اور حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے"۔

یہ تمام صورت حال آپ کے سامنے ہے' اسے ذہن میں رکھ کر مولانا مودودی کی مذکورہ عبارت کو ایک بار پھر پڑھیے' مولانا نے یہ واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا حضرت معاویہؓ اس مسئلے میں بالکل منفرد ہیں' اور کسی اجتہادی رائے کی بنا پر نہیں بلکہ (معاذ اللہ) کسی سیاسی غرض سے انھوں نے یہ "بدعت" جاری کی ہے۔ اور اس طرح "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کر ڈالا ہے' لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ سراسر فقہی مسئلہ ہے جس میں وہ تنہا بھی نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت معاذ ابن جبلؓ جیسے جلیل القدر صحابی (جن کے علم و فقہ پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت[1] موجود ہے) اور تابعینؒ میں سے مسروقؒ' حسن بصریؒ' ابراہیم نخعیؒ' محمد بن حنفیہؒ' محمد بن علی بن حسینؒ اور اسحاق بن راہویہؒ جیسے فقہا بھی ان کے ساتھ ہیں۔

اور تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجیے کہ اگر حضرت معاویہؓ اپنے اس اجتہاد میں بالکل تنہا ہوں تب بھی آخر اس بات کا کیا جواز ہے کہ ان کے اس اجتہاد کو "بدعت" کہا جائے' یا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ انھوں نے سیاست کو دین پر غالب رکھنے اور "حلال و حرام کی تمیز" کو مٹا دینے کی "پالیسی" شروع کر دی تھی' کیا حضرت علیؓ سے اختلاف کر کے حضرت معاویہؓ کو اتنا بھی حق نہیں رہا کہ وہ کسی شرعی مسئلے میں اپنے علم و فضل سے کام لے کر کوئی اجتہاد کر سکیں؟ جب کہ وہ فقہا میں سے ہیں' اور ان کے بارے میں صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ:

"قیل لابن عباسؓ ھل لک فی امیر
المومنین معاویۃ؟ ما اوتر الا بواحدۃ!
قال: اصاب' انہ فقیہ[2]"

"حضرت ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ
امیر المومنین معاویہؓ ہمیشہ ایک رکعت وتر
پڑھتے ہیں' کیا آپ اس معاملہ میں کچھ فرمائیں
گے؟ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا:
انھوں نے درست کیا' وہ فقیہ ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ وہ امام زہریؒ جن کا مقولہ مولانا مودودی صاحب نے نقل کیا ہے' حضرت معاویہؓ سے اس معاملے میں اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے اس فعل کو "بدعت" نہیں کہتے' بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے:

"راجع السنۃ الاولیٰ"
"پہلی سُنّت کو لوٹا دیا[3]"

اس میں "پہلی" "پہلی سُنّت" کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ دوسری سنّت' جو حضرت معاویہؓ نے جاری رکھی تھی' وہ بھی سُنّت ہی تھی' بدعت نہ تھی' لیکن حیرت ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان کے اس جملے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں:

"حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس
بدعت کو موقوف کیا" (ص ۱۷۳)

۲۔ نصف دیت کا معاملہ

حضرت معاویہؓ کے عہد میں "قانون کی بالاتری کے خاتمے" اور سیاست کو دین پر غالب رکھنے کی "پالیسی" کی دوسری شہادت مولانا مودودی نے یہ پیش کی ہے:

"حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں[4] کہ دیت کے

۱؎ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعلمہم بالحلال والحرام معاذ بن جبل

۲؎ صحیح بخاری' کتاب المناقب' ذکر معاویہ بن ابی سفیانؓ۔ ص ۵۳۱ ج ۱۔ نور محمد کراچی

۳؎ البدایۃ والنہایۃ۔ ص ۲۳۲ ج ۹

۴؎ اس معاملے میں بھی مولانا مودودی سے غلطی ہوئی ہے' یہ مقولہ خود حافظ ابن کثیرؒ کا نہیں ہے بلکہ امام زہریؒ ہی کا ہے' وبہ قال الزہری کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سُنّت
کو بدل دیا، سُنّت یہ تھی کہ معاہد کی دیت
مسلمان کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہؓ
نے اس کو نصف کر دیا۔ اور باقی نصف خود
لینی شروع کر دی" (ص ۱۷۳، ۱۷۴)

اس میں اوّل تو خط کشیدہ جملہ نہ حافظ ابن کثیرؒ کا ہے، نہ امام زہریؒ کا بلکہ یہ خود مولانا کا ہے۔ یہ نشان دہی ہم نے اس لئے کی ہے کہ مولانا کی عبارت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حافظ ابن کثیرؒ کا ہے) البدایہ والنہایہ کی اصل عبارت یہ ہے:

"وبه قال الزهري ومضت السنّة أن دية المعاهد كدية المسلم وكان معاوية أوّل من قصرها الى النصف وأخذ النصف لنفسه"[1]

"مذکورہ سند ہی سے امام زہریؒ کا قول ہم تک پہنچا ہے کہ: سنت یہ چلی آتی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہوگی، اور حضرت معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا، اور نصف اپنے واسطے لے لی۔"

یہ درست ہے کہ یہ عبارت سرسری نظر میں بڑی مغالطہ انگیز ہے کیونکہ اس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے باقی نصف دیت خود اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کر دی تھی، لیکن کاش! مولانا مودودی اس مجمل اور سرسری مقولے کو دیکھ کر حضرت معاویہؓ پر اتنا سنگین الزام عائد کرنے سے قبل صورتِ حال کی پوری تحقیق فرما لیتے، ہمارا خیال ہے کہ اگر مولانا اس موقع پر شروح حدیث میں سے کسی بھی مستند کتاب کی مراجعت فرماتے تو کوئی غلط فہمی باقی رہتی۔

واقعہ اصل میں یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا یہ مقولہ نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کا پورا مقولہ سامنے ہو تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، مشہور محدث امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ان کا یہ مقولہ ابن جریج کی سند سے پوری تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے:

"عن الزهري قال كانت دية اليهودي والنصراني في زمن نبي الله صلى الله عليه وسلم مثل دية المسلم وأبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم فلما كان معاوية أعطى أهل المقتول النصف وألقى النصف في بيت المال قال ثم قضى عمر بن عبد العزيز في النصف وألقى ما كان جعل معاوية"[2]

"امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی کی دیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان کی دیت کے برابر تھی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا۔ پھر جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو آدھی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدھی بیت المال میں داخل کر دی، پھر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دیت تو آدھی ہی رکھی، مگر (بیت المال کا) جو حصہ حضرت معاویہؓ نے مقرر کیا تھا وہ ساقط کر دیا۔"

اس سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ حضرت معاویہؓ نے آدھی دیت خود لینی شروع نہیں کی تھی بلکہ بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس میں "اخذ النصف لنفسه"

---

[1] البدایہ والنہایہ، ص ۱۳۹ ج ۸

[2] السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ص ۱۰۲ ج ۸ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۴ھ

(آدھی خود لینی شروع کر دی) سے مُراد بیت المال کے لئے لینا ہے نہ کہ اپنے ذاتی استعمال کے لئے۔

اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہد کی دیت مسلمان کے برابر مقرر کی تھی تو حضرت معاویہؓ نے اسے نصف کر کے باقی نصف کو بیت المال میں کیوں داخل کر دیا۔؟ سو حقیقت یہ ہے کہ معاہد کی دیت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایتیں مروی ہیں، اس لئے یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس طرح منقول ہے کہ:

"عقلُ الکافر نصف دیۃ المسلم"[۱]

"کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی"

چنانچہ اسی حدیث کے پیش نظر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ اسی بات کے قائل ہیں کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہیے[۲] اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"دیۃ ذمّی دیۃ مُسلم"

"ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے"[۳]

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا مسلک اسی حدیث پر مبنی ہے، اور وہ مسلمان اور معاہد کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے[۴]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ یہ دونوں روایتیں مروی ہیں، اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دلوا دی اور باقی نصف بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی ایک عقلی وجہ بھی خود بیان فرمائی، حضرت ربیعہؒ فرماتے ہیں کہ:

"فقال معاویۃ إن کان أھلہ أصیبوا بہ فقد اصیب بہ بیت مال المسلمین فاجعلوا البیت مال المسلمین النصف ولأھلہ النصف خمسمائۃ دینار ثم قتل رجلٌ اٰخر من أھل الذمۃ فقال معاویۃ لو أنا نظرنا إلی ھذا الذی یدخل بیت المال فجعلناہ وضیعا عن المسلمین وعونا لھم"[۵]

"حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ ذمی کے قتل سے اگر اس کے رشتہ داروں کو نقصان پہنچا ہے تو مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچا ہے (کیونکہ جو جزیہ وہ ادا کیا کرتا تھا وہ بند ہو گیا تھا) لہٰذا دیت کا آدھا حصہ (پانچسو دینار) مقتول کے رشتہ داروں کو دے دو اور آدھا بیت المال کو، اس کے بعد ذمیوں میں سے ایک اور شخص قتل ہوا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ جو رقم ہم بیت المال میں داخل کر رہے ہیں، اگر ہم اس پر غور کریں تو اس سے ایک طرف مسلمانوں کا بوجھ ہلکا ہوا اور دوسری طرف یہ ان کے لئے اعانت بھی ہوئی۔"

ایک مجتہد کو حق ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس اجتہاد

---

[۱] رواہ احمدؒ والنسائیؒ والترمذیؒ وروی مثلہ ابن ماجہؒ (نیل الأوطار ص ۶ ج ۷ مطبعہ عثمانیہ ۱۳۵۷ھ

[۲] نیل الاوطار ص ۶۵ ج ۷ وبدایۃ المجتہد ص ۴۱۴ ج ۲

[۳] السنن الکبریٰ للبیہقیؒ ص ۱۰۲ ج ۸

[۴] نیل الاوطار، ص ۶۵ ج ۷ وبدایۃ المجتہد ۴۱۴ ج ۲

[۵] مراسیل ابی داؤدؒ ص ۱۳ مطبوعہ اصح المطابع۔ والجوہر النقی تحت البیہقیؒ ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۸، ہم نے یہ الفاظ موخر الذکر سے نقل کئے ہیں، اول الذکر میں "وضیعاً عن" کے بجائے "وظیفاً علی" کا لفظ ہے۔

سے علمی طور پر اختلاف کرے لیکن یہ اعتراف ہر غیر جانبدار شخص کو کرنا پڑے گا کہ حضرت معاویہؓ نے اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعارض احادیث میں جس خوبی کے ساتھ تطبیق دی ہے وہ ان کے تفقّہ اور علمی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انصاف فرمائیے کہ ان کے اس حسین فقہی اجتہاد کی تعریف کرنے کے بجائے اسے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" قرار دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟

یہاں ایک بات اور واضح کر دینا مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ اگرچہ امام زہریؒ کا قول یہی ہے کہ حضرت معاویہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر قرار دیتے آرہے تھے اور حضرت معاویہؓ نے پہلی بار اس میں تغیر کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں روایات بہت مختلف ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں تو ہم ابھی لکھ کر آئے ہیں، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی اس معاملے میں مختلف روایات مروی ہیں، بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ ان کے عہد میں ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے ایک تہائی وصول کی جاتی تھی۔ مشہور محدّث علامہ ابن الترکمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وعمرؓ وعثمانؓ قد اختلف عنهما[1]
اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے مختلف روایات مروی ہیں۔

اسی لئے امام شافعیؒ نے بھی اسی ایک تہائی والے مسلک کو اختیار کیا ہے[2]

۴۔ مالِ غنیمت میں خیانت:

ایک اسی قسم کا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:-

"مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال دیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔" (ص: ۱۷۴)

اس اعتراض کی سند میں مولانا نے پانچ کتابوں کے حوالے دئے ہیں، جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۹ جلد ۸ کا حوالہ بھی ہے، ہم یہاں اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں:-

"وفي هذه السنة غزا الحكم بن عمرو نائب زياد على خراسان جبل الأسل عن أمر زياد فقتل منهم خلقا كثيرا وغنم اموالا جمة، فكتب اليه زياد: إن امير المؤمنين قد جاء كتابه أن يصطفى له كل صفراء وبيضاء - يعني الذهب والفضة - يجمع كله من هذه الغنيمة لبيت المال فكتب الحكم بن عمرو: إن كتاب الله مقدم على كتاب امير المؤمنين، وانه والله لو كانت السماوات والأرض على عبد فاتقى الله يجعل له مخرجا، ثم نادى في الناس أن اغدوا على قسم غنيمتكم فقسمها بينهم وخالف زيادا فيما كتب اليه عن معاوية وعزل الخمس كما أمر الله ورسوله[3]"

[1] الجوہر النقی تحت سنن البیہقی ص ۱۰۳ ج ۸ مزید ملاحظہ ہو نیل الاوطار ص ۶۵ ج ۷
[2] نیل الاوطار بحوالہ مذکور وبدایۃ المجتہد ص ۴۱۴ ج ۲
[3] البدایۃ والنہایۃ ص ۲۹ ج ۸

وہ اسی سال خراسان میں زیاد کے نائب
حضرت حکم بن عمروؓ نے زیاد کے حکم سے
جبل الاسل کے مقام پر جہاد کیا بہت سے
آدمیوں کو قتل کیا اور بہت سا مالِ غنیمت
حاصل کیا، تو زیاد نے انھیں لکھا کہ امیرالمومنین
کا خط آیا ہے کہ سونا چاندی ان کے لئے الگ
کرلیا جائے اور اس مالِ غنیمت کا سارا سونا
چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔ حکم
بن عمروؓ نے جواب میں لکھا کہ اللہ کی کتاب
امیرالمومنین کے خط پر مقدم ہے، اور خدا
کی قسم اگر آسمان وزمین کسی کے دشمن ہوجائیں
اور وہ اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لئے
کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے پھر انھوں نے
لوگوں میں اعلان کیا کہ تم اپنے مالِ غنیمت
کو تقسیم کرنا شروع کرو، چنانچہ اس مالِ غنیمت
کو انھوں نے لوگوں کے درمیان تقسیم کردیا
اور زیاد نے حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب
کرکے جو کچھ انھیں لکھا تھا، اسکی مخالفت
کی اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ اور
اس کے رسول کے حکم کے مطابق بیت المال
کے لئے الگ کیا۔"

اس عبارت کا مولانا مودودی صاحب کی عبارت کیساتھ مقابلہ فرمائیے تو مندرجہ ذیل فرق واضح طور پر نظر آئیں گے:

(۱) البدایہ والنہایہ کی اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ اس حکم کی رو سے حضرت معاویہؓ کی ذات کے لئے سونا چاندی نکالنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ بیت المال کے لئے نکالنا پیشِ نظر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ حکم کے الفاظ صاف لکھ رہے ہیں کہ:

"یجمع کلہ من ھذہ الغنیمۃ لبیت المال"

"اس مالِ غنیمت میں سے سارا سونا چاندی
بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔"

مگر مولانا مودودی اسی عبارت کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت
میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال
لیا جائے۔" (ص: ۱۷۴)

ہمارا ناطقہ قطعی طور پر سربگریباں ہے کہ اس تفاوت کی کیا تاویل کیا توجیہ کریں۔؟

(۲) مولانا مودودی کی عبارت کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا یہ تاثر لے گا کہ جن تواریخ کا مولانا نے حوالہ دیا ہے ان میں صراحت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا یہ حکم براہ راست منقول ہوگا، اسی حکم کو دیکھ کر مولانا نے یہ عبارت لکھی ہے لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ البدایہ والنہایہ میں اور اسی طرح باقی تمام تواریخ میں حضرت معاویہؓ کا براہ راست کوئی حکم منقول نہیں بلکہ زیاد نے ان کی طرف منسوب کرکے اپنے ایک نائب کو ایسا لکھا تھا[1] اور یہ بات کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے واقعۃً زیاد کو ایسا لکھا تھا یا زیاد نے خواہ مخواہ انکی طرف یہ غلط بات منسوب کردی تھی؟

(۳) مولانا مودودی نے اس "حکم" کا تو ذکر فرمایا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ اس حکم کی تعمیل سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ اگر اصل کتابوں کی مراجعت نہ کی جائے تو ہر پڑھنے والا یہ سمجھے گا کہ یقیناً اس حکم کی تعمیل بھی کی گئی ہوگی۔ حالانکہ آپ نے دیکھا البدایہ والنہایہ میں صاف تصریح ہے کہ حضرت حکم بن عمروؓ نے اس مجمل حکم کی بھی تعمیل نہیں فرمائی۔

(۴) مولانا مودودی صاحب کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ حکم مستقل طور سے جاری کردیا ہوگا۔ حالانکہ اگر زیاد کو سچا مان لیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ حکم ایک خاص جہاد سے متعلق تھا۔ گویا صورتحال تاریخ کی

[1] اسی وجہ سے حافظ ابن کثیرؒ نے بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "خالف زیادا فیما کتب إلیہ عن معاویۃ" اور خالف معاویۃ نہیں فرمایا۔

روشنی میں یہ ہے کہ زیاد نے اپنے ایک نائب کو خط لکھتے وقت یہ لکھا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے لکھا ہے کہ جبل الاسل کے جہاد میں جو مالِ غنیمت ملا ہے اس میں سے سونا چاندی بیت المال کے لئے الگ کرلیا جائے۔ نائب کو زیاد کا یہ خط ملا مگر اس نے اس حکم کو کتاب اللہ کے خلاف سمجھ کر اس کی تعمیل نہ کی لیکن مولانا نے آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ دیا اور حضرت معاویہؓ پر مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب وسنّت کی "صریح خلاف ورزی" کا الزام لگا کر براہ راست لکھ دیا کہ:

"حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت
میں سے سونا چاندی ان کے لئے الگ
نکال لیا جائے۔"

تاریخ کے اندر اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے' اسے ہم نے اوپر بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔ اب مولانا مودودی کی عبارت سے قطع نظر کر کے اصل عبارت پر آپ غور فرمائیں گے تو ممکن ہے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر حضرت معاویہؓ کا یہ حکم شریعت کے مطابق تھا تو حضرت حکم بن عمروؓ نے جو خود صحابہؓ میں سے ہیں' اس پر اتنی خفگی کا اظہار کیوں فرمایا؟ اور اسے کتاب اللہ کے خلاف کیوں قرار دیا۔؟ اس شبہ کے جواب میں عرض ہے کہ جتنی تواریخ ہم نے دیکھی ہیں' ان سب میں یہ واقعہ اس قدر اجمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے صحیح صورت حال کا پتہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔

اوّل تو زیاد کا واسطہ ہی مخدوش ہے' کچھ پتہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے واقعتہً اسے اس مضمون کا کوئی خط لکھا بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر لکھا تھا تو اس کے الفاظ کیا تھے؟ اور ان کا واقعی منشا کیا تھا؟ زیاد نے ان کے الفاظ روایت بالمعنی (INDIRECT NARRATION) کے طور پر ذکر کئے ہیں جس میں ردّ و بدل کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ زیاد نے کسی بد دیانتی یا غلط فہمی کے بغیر حضرت معاویہؓ کا خط درست طور پر نقل کیا ہو تب بھی عین ممکن ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو اور حضرت معاویہؓ اپنے اندازے یا کسی اطلاع کی بنا پر یہ سمجھے ہوں کہ جبل الاسل کے جہاد میں جو سونا چاندی ہاتھ آیا ہے وہ کُل مالِ غنیمت کے پانچویں حصّے سے زائد نہیں ہے اس لئے انھوں نے بیت المال کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ حکم جاری فرمایا ہو کہ مالِ غنیمت میں سے جو پانچواں حصّہ بیت المال کے لئے بھیجا جائے گا اس میں دیگر اشیا کے بجائے صرف سونا چاندی ہی بھیجا جائے۔ ظاہر ہے یہ حکم کسی طرح کتاب وسنت کے خلاف نہ تھا لیکن حضرت حکم بن عمروؓ نے اس پر اس لئے ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ فی الواقعہ مالِ غنیمت کے طور پر ملنے والا سونا چاندی پانچویں حصّہ سے زائد تھا۔ ایسی صورت میں وہ سارا سونا چاندی بیت المال میں داخل کرنے کو کتاب اللہ کے خلاف تصوّر کرتے تھے۔

غرض اس مجمل واقعے کی بہت سی توجیہات ممکن ہیں۔

اب یہ بات عقل اور دیانت کے قطعی خلاف ہوگی کہ ہم ان قوی احتمالات کو قطعی طور پر رد کر دیں جن سے حضرت معاویہؓ کی مکمل برات واضح ہوتی ہو' اور جو ضعیف احتمالات انکی ذات والا صفات کو مجروح کرتے ہوں انھیں اختیار کر کے بلا تامّل یہ حکم لگا دیں کہ "حضرت معاویہؓ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی"

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی طرف یہ بات تو بالکل غلط منسوب کی ہے کہ انھوں نے مالِ غنیمت کا سونا چاندی اپنے لئے نکالنے کا حکم دیا تھا' ہاں زیاد کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے سونا چاندی بیت المال کے لئے نکالنے کا حکم دیا تھا' مگر اوّل تو زیاد کا واسطہ مخدوش ہے' دوسرے ان کا یہ عمل شریعت کے خلاف نہیں تھا لہٰذا یہ اعتراض کسی طرح درست نہیں۔

(باقی آئندہ)

اصلاحِ انقلابِ امت

حکیم الامت حضرت مولانا
اشرف علی تھانوی رح

" حضرت تھانوی ؒ کا یہ مضمون ماہنامہ القاسم دیوبند شوال ۱۳۲۹ھ کے شمارے سے نقل کیا جارہا ہے، اور یہ اُس سلسلۂ مضامین کا جزو ہے جو حضرت ؒ نے "اصلاح انقلابِ امت" کے نام سے تحریر فرمایا تھا۔ یہ مضامین اپنی ہمہ گیر افادیت کے باوجود آج نایاب ہو چکے ہیں۔ امید ہے کہ انہیں ذوق وشوق اور جذبۂ عمل کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ (ادارہ) "

اپنی نمازیں درست کیجئے

ایک کوتاہی نماز کے متعلق یہ ہے کہ بعضے آدمی حتی الامکان نماز تو فوت نہیں ہونے دیتے مگر وقت کا اہتمام نہیں ہوتا اکثر تنگ وقت میں نماز پڑھتے ہیں بعض دفعہ قضا بھی ہو جاتی ہے گو کم سہی ——— اور گو پھر فوراً قضا پڑھ بھی لیتے ہیں پھر بعض کو تو کوئی مجبوری ظاہر ہوتی ہے گو وہ مجبوری اس لئے معتبر نہیں کہ کہ اگر اس میں سعی و توجہ کرتے تو ضرور کوئی صورت انتظام کی نظر آتی مگر بعض تو محض بیکار گپوں میں مشغول رہ کر وقت کو اخیر کر دیتے ہیں۔ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ بعضے ان میں مشائخ ہیں اور محض تضلیل شیطانی یا تسویل نفسانی سے تاخیر صلوٰۃ کے خوگر ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ہر ایک کے متعلق مختصر مختصر کلام کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ظاہراً کوئی مجبوری بتلاتے ہیں اُن میں بعض کو تو کسی درجہ میں بھی مجبوری نہیں جیسے تاجر و مزدور و حاکم اجلاس و اہلِ حرفہ و امثالہم کہ یہ لوگ بالکل آزاد ہیں تھوڑی دیر کے لئے کام چھوڑ سکتے ہیں سو اُن کے عذر کے متعلق تو کسی جواب کی ضرورت نہیں اور

بعض کو البتہ کسی درجہ میں مجبوری ہے جیسے نوکر ایسے افسر کا جس کے سامنے اپنی رائے سے کچھ نہیں کر سکتا سو اس کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اوقاتِ نماز میں اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور دیکھا سُنا اکثر یہی ہے کہ باستثنائے شاذ و نادر کوئی افسر نماز سے منع نہیں کرتا اور اگر کسی طرح اجازت حاصل نہ ہو نہ خود اُس سے نہ اُس کے بالا افسر سے تو اس صورت میں ایسی نوکری ہی جائز نہیں خدا تعالیٰ دوسرا سامان رزق کا کریگا۔ ایسی نوکری چھوڑ دینا چاہیئے۔ البتہ جس شخص کے پاس بظاہر سر دست کوئی سبیل ضروری معاش کی بھی نہ ہو نہ نوکری میں نہ سرمایہ ہو کہ تجارت کرے نہ مزدوری کی عادت ہو اور بدون عادت چلنا دشوار ہوتا ہے تو ایسی حالت میں نوکری چھوڑنے میں تعجیل نہ کرے اس فکر میں لگا رہے دوسرے خیر خواہوں سے بھی سعی کرا دے اور تا حصول کسی سبیل کے ہمیشہ اس بلائے اختلال وقت صلوٰۃ سے استغفار اور دعائے استخلاص اور دوسری سبیل کے استحصال کی کرتا رہے۔

اور جن کو برائے نام بھی مجبوری نہیں محض بیکار وقت ضائع کرتے ہیں اُن کو اپنی حالت پر خاص طور سے نظر کرنا چاہیئے اور نفس سے محاسبہ کرنا چاہیئے کہ جب پانچوں وقت نماز پڑھنا پڑے تو تاخیر اوقات سے کونسی آسانی و تخفیف نکلی اور مجبوری کچھ ہے نہیں تو نہ کوئی مصلحت تھی کہ تاخیر کے اختیار کرنیکا مرجح ہو نہ کوئی مجبوری تھی کہ تاخیر بالاضطرار کا سبب ہو پھر وبال لینے سے کیا حاصل ہوا۔ اگر نفس یہ کہے کہ تاخیر کرنے سے مشغلہ تفریح کا وقت زیادہ مل سکتا ہے تو اس کو جواب دینا چاہیئے کہ اگر دو نمازیں اول وقت میں پڑھی جاویں تب بھی ان کے مابین اتنی ہی گنجائش ہوگی جتنی ان دونوں نمازوں کو اخیر وقت پر پڑھنے سے ملتی ہے۔ مثلاً اگر کسی نے ظہر چار بجے پڑھی اور عصر سات بجے تو درمیان میں تین گھنٹے ملے۔ سو اگر ظہر دو بجے پڑھتا اور عصر پانچ بجے تب بھی درمیان میں تین گھنٹے ملتے تو جتنا کام درمیان میں تاخیر کی صورت میں کرسکتا ہے اتنا ہی تعجیل کی صورت میں کر سکتا ہے۔ پھر تاخیر میں بجز مضرت کے کونسی مصلحت ہوئی۔

اور ایسے مشائخ کو اولاً تو تضلیل شیطانی اور کبھی تسویل نفسانی اس تاخیر کا سبب ہوتی ہے۔ تضلیل شیطانی اس طرح کہ انھوں نے اپنی تجویز سے یا اپنے شیخ کی تعلیم سے کوئی معمول یا ورد ایک خاص مقدار سے مقرر و ملتزم کرلیا اور اس میں وقت کی تعیین محض کسی مصلحت زائدہ غیر ضروریہ کے سبب سے تھی مگر بر وئے غلو اس عالم ملتزم نے اسکو ایسا ضروری سمجھا کہ اُس کی حفاظت کے لئے مہماتِ دینیہ کی بھی پروا نہ رہی مثلاً بعض اوراد مابین سنت و فرض فجر کے پڑھے جاتے ہیں۔ میں نے بعض متشددین و مصرین کو دیکھا ہے جماعت کھڑی ہوگئی مگر وہ اپنے ورد میں مشغول ہیں حتیٰ کہ جماعت فوت کردی اور بعض اوقات خود وقت بھی تنگ ہوگیا۔ مگر اُس ورد کی ترتیب میں تغیر و تبدیل کو ہرگز جائز نہ رکھیں گے۔ حالانکہ یہ تغیر فی نفسہٖ جائز تھا اور جب عدم تغیر سے جماعت فوت ہو کلاً یا بعضاً یا وقت تنگ ہو جائے اس وقت تغیر واجب تھا مگر ان کو ترک واجب کی ذرا پروا نہیں۔ پھر اپنے اس التزام پر اس قدر شاداں و نازاں ہیں کہ اپنے کو صاحبِ استقامت سمجھتے ہیں کہ کبھی معمول میں تغیر نہیں ہوتا۔ میں نے ایک شخص کو یہ فخر کرتے ہوئے سُنا ہے کہ صاحب میری فرض نماز تو ناغہ ہوجاتی ہے مگر پیر صاحب نے جو کچھ بتلایا ہے کبھی وہ قضا نہیں ہوتا غلو[1] فی الدین اور اتخاذ احبار و رہبان کی یہ اقبح افراد میں سے ہے سبب اس کا جہل ہے علوم شرعیہ سے کہ حدود و اعمال کی معلوم نہیں۔ خواہ یہ بے علمی بسیط ہو یا مرکب ہو علی اختلاف الاقوال۔ یہ تو تضلیل شیطانی تھی اور تسویل نفسانی اس طرح سے ہے کہ افراط فی الشفقۃ علی الخلق کے سبب یہ خیال ہوتا ہے کہ جلدی پڑھ لینے سے بہت لوگ جماعت سے رہ جاویں گے خوب انتظار کرنا چاہیئے تاکہ سب جماعت میں ملجاویں اور کوئی محروم نہ رہے اس کا نام تسویل اس لئے رکھا گیا کہ صورۃً یہ خیال نہایت محمود ہے اور نفسانی اس لئے کہا گیا کہ منشا اس کا ایک صفت ہے صفاتِ نفسانیہ سے کہ وہ شفقت ہے اور گو وہ فی نفسہٖ صفتِ محمودہ ہے اور اس لئے جو خیال اس سے ناشی ہے کہ وہ خیر خواہی ہے آنیوالے نمازیوں کی کہ کوئی محروم نہ رہجاوے۔ وہ بھی نیک ہے مگر ہر محمود اسی وقت تک محمود ہے جب تک وہ کسی امرِ مذموم کو متضمن نہ ہو اور یہاں یہ شفقت اور یہ خیر خواہی سبب ہوگئی تضییق[2] وقت کی حدِ غیر مشروع تک اور یہ مذموم ہے اس لئے وہ منشا اور ناشی سب مذموم ہوگیا اور ان سب نمازوں میں سب سے زیادہ قابلِ نظر ایسے حضرات کے لئے جمعہ کی نماز ہے کیونکہ اور نمازوں کا اگر وقت نکل گیا اور علم نہوا تو وہ فرد قضا کی تو بن سکتی ہیں گو بعض فقہاء

---

[1] یعنی حق تعالیٰ نے جو دین میں تشدد کرنیوالوں کی اور اپنے پیشواؤں کو بمنزلہ معبود سمجھنے والوں کی سخت مذمت فرمائی ہے اسی کی بہت بُری مثال یہ جاہلانہ فعل ہے ۱۲ فقیر معز حسین۔ [2] یعنی اس خیر خواہی کیوجہ سے وقت اسقدر تنگ ہوگیا جسکی شرعاً اجازت نہیں ۱۲۔

کے نزدیک بھی اور جمعہ کا وقت اگر نکل گیا تو اس کی قضا ظہر سے ہوسکتی تھی نہ کہ جمعہ سے پس جب جمعہ پڑھا تو وہ نہ ادا ہوا کیونکہ وقت نہ تھا اور نہ قضا کیونکہ قضا میں جمعہ نہیں پڑھا جاتا تو بس یہ نماز ان سب کے ذمہ پر واجب رہی اور رہی وہ مصلحت کہ کوئی رہ نہ جاوے۔ اول تو جب اُس میں اتنا بڑا مفسدہ لازم ہے تو اس مصلحت کا کیا اعتبار۔ پھر وہ مصلحت بھی کچھ تاخیر کے ساتھ خاص نہیں تجربہ سے یہ امر یقینی ہے کہ اس باب میں جس جگہ جیسی عادت کا التزام کر لیا جاتا ہے تمام لوگ اسی کے تابع ہو جاتے ہیں جہاں سویرے نمازیں ہوتی ہیں سب کو تقاضا سا رہتا ہے کہ جلدی چلو چنانچہ سب فوراً جمع ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی متخلف نہیں رہتا۔ اور جو رہنے والے ہیں وہ مشاہدہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اس تاخیر میں بھی رہ جاتے ہیں۔

بلکہ اکثر رہتے ہیں ان کو بے فکری رہتی ہے کہ میاں ابھی کیا جلدی ہے وہاں تو بہت دیر میں جماعت ہوا کرتی ہے بس اسی میں رہ جاتے ہیں تو تاخیر کی وہ غرض بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور اگر حاصل بھی ہوتی تب بھی وہ لاحاصل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ بہرحال وقت کا اسقدر مؤخر کرنا نماز کا بالکل تباہ کرنا ہے چنانچہ احادیث میں اس پر سخت زجر آیا ہے اور ایسی نماز کو منافقوں کی نماز فرمایا ہے۔ اور گاہ گاہ اہل علم میں سے بھی بعض کو اس میں ابتلا ہوتا ہے جس کا اکثر موقع یہ ہوتا ہے کہ مدرس کو کوئی کتاب ختم کرانا ہے یا سبق کسی خاص مقام تک پہنچانا ہے یا ممتحن کو کسی جماعت کو امتحان سے فارغ کرنا ہے یا مصنف کو کسی مضمون کا پورا کرنا ہے تو ان مقاصد کو رعایتِ وقت پر لبا اوقات ترجیح دے دی جاتی ہے اس کا وقوع علماء سے بہ نسبت مشائخ کے اور بھی زیادہ عجیب ہے کیونکہ یہ اصل وضع میں مقتدائے دین ہیں۔ جب مقتدا ایسا کریگا پھر مقتدی کا کیا پوچھنا ہے۔

ایک کوتاہی (گو ایسا شاذ ہوتا ہے مگر ہوتا ہے) اس کوتاہی مذکور کے مقابل کوتاہی ہے یعنی نماز میں اس قدر تعجیل کرنا کہ وقت بھی آنا یقینی نہ ہو۔ بعض لوگ فجر کی نماز صبح صادق سے پہلے شروع کرتے ہوئے دیکھے سُنے گئے۔ بعض اہلِ افراط جمعہ کے روز دن بھی نہیں ڈھلنے دیتے اور کھڑے ہو جاتے ہیں بعضے مریضوں کو دیکھا گیا کہ مغرب کے تھوڑے ہی دیر بعد آسانی کے لیے عشا پڑھ لیتے ہیں وقت بھی نہیں آتا۔ اور جس کے مسلک پر مثلین کا قول بھی قوت رکھتا ہو اس کے لئے عصر کی نماز مثلین کے قبل پڑھ لینا احتیاط کے خلاف ضرور ہے۔ بہرحال وقت میں افراط و تفریط کرنا دونوں واجب التحرز ہیں۔ اگر اجلاس پر حاضری کا معین وقت پر حکم ہو تو قبل از وقت آکر اظہار دینا یا وقت ختم کر کے آنا دونوں بیکار ہیں تو شریعت کی تعیین کی وقعت و عظمت کیوں نہ کیجائے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ شرائط و ارکان میں ذرا سے عذر موہوم سے اُسی رخصت پر عمل کرنے لگتے ہیں جو کہ عذر قوی کے متعلق ہے۔ مثلاً ذرا حرارت کا شبہ ہوا یا ذرا ہوا میں خنکی ہوئی بجائے وضو و غسل کے تیمم کر لیا ذرا طبیعت میں کسل ہوا بیٹھکر نماز پڑھنے لگے۔ ریل میں ذرا جگہ کی تنگی ہوئی جس کا آسانی سے انتظام ہوسکتا تھا بیٹھکر اور بعض دفعہ بے رُخ بعض دفعہ اشارہ سے نماز پڑھنا شروع کر دی بلکہ ریل میں تو بالکل نماز ہی اُڑا دیجاتی ہے۔ بالخصوص عورتیں تو ریل میں شاذ و نادر ہی نماز پڑھتی ہوں گی اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ یہاں نہ پانی ٹھیک ہے نہ جگہ گنجائش کی ہے نہ تختہ پاک ہے نہ رُخ معلوم ہے یا رُخ کی طرف پڑھنا دشوار ہے نہ پردہ کا پورا انتظام ہے۔ اور ان عذروں سے مستورات کی نماز بہل کے سفر میں بھی اکثر برباد ہوتی ہے اور ان سے زیادہ ان لوگوں کی حالت قابلِ حسرت ہے جو حج کو جاتے ہیں اور ریل یا جہاز میں بیہودہ وساوس سے یا کاہلی سے نماز نہیں پڑھتے ایک عبادت ادا کرنے چلے اور پانچ فرض روزانہ برباد کیئے اگر جہاز ہی کی ضائع شدہ نمازیں شمار کی جاویں اور ایک پھیرے

میں پندرہ دن کی رفتار فرض کیجاوے تو پانچ نماز روز کے
حساب سے پچھتر نمازیں ہوتی ہیں اور اسی طرح اگر واپسی کا
پھیر لیا جاوے تو اتنی ہی اس میں ہو کر ڈیڑھ سو ہوئیں
کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک فرض ادا کیا اور ڈیڑھ
سو فرض برباد گئے۔ کیا ایسے شخص کے حج کو کہا جاسکتا ہے
کہ خدا کا فرض سمجھ کر کیا گیا ہے اگر یہ تھا تو ڈیڑھ سو فرض بھی
تو خدا ہی کے تھے ان کو کس دل سے ضائع کرنا گوارا کیا سچ یہ ہی
کہ ہم لوگوں کو باعث عبادت کا بھی اکثر امور نفسانیہ امتناز یا
دفع ملامت وغیرہ ہوتا ہے یا اگر مجرد نہیں ہوتا تو آمیزش زیادہ
ضروری ہوتی ہے۔ بہرحال اگر ان لچر بہانوں پر نماز ترک کردی
تب بھی اور اگر اس میں بلا فتویٰ شرعی رخصت پر عمل کرلیا کہ وہ
بھی ترک ہی کے حکم میں ہے تب بھی نہایت بد دلی کی دلیل
ہے۔ ایسی نماز پر تو خاصہ شبہ ہوتا ہے کہ محض دکھلاوے
کے لئے نام کرنے کو پڑھتے ہیں۔ ایسے نمازیوں کی شان میں
فرمایا گیا ہے واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی یُراؤن
الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلاً بڑی وجہ اسکی دو امر ہیں
ایک مسائل کی ناواقفی۔ دوسرے نماز کی عظمت دل میں نہ ہونا
اوّل کا علاج علم و واقفیت ہے جس کا طریق سہل یہ ہے
کہ نماز کے متعلق جو صورتیں پیش آجاویں یا جو جو احتمال ذہن
میں آتے رہیں اُن سب کو حافظہ میں یا کتابت میں مقید
ومحفوظ کر کے زبانی یا بذریعہ خط وکتابت علماء ماہرین سے
پوچھتے رہیں۔ دوسرے کا علاج یہ ہے کہ دل میں وعیدین
مخالفت احکام کی سوچیں تاکہ ان احکام کی عظمت پیدا ہو
جب عظمت پیدا ہوگی تو ضرور اسکی کوشش وارادہ کریگا
جب کوشش وارادہ کرے گا خود ان عذروں کا لغو ہونا
سمجھ میں آجاوے گا۔ کیا کبھی تقریب میں جانے کے وقت
یا کسی معزز مہمان کے آنے کے وقت جب کہ بدن اور
کپڑے میلے ہوں کبھی شخص جو ادنیٰ بہانہ سے تیمم کرتا ہے
غسل کر کے کپڑے بدلتا ہوا نہیں دیکھا جاتا۔ کیا ایسے
ہی موقع پر اگر دیر تک کھڑا ہونا پڑے بلکہ چلنے کی ضرورت
ہو تو کیا اس کو آسان نہیں ہوجاتا مگر نماز میں کھڑا نہیں ہوا
جاتا۔ کیا ریل میں اپنی آسائش کی ضرورت سے یا اپنے کسی
مریض رشتہ دار کے آرام دینے کے لئے مسافروں سے جگہ
دینے کی اس نے کبھی درخواست نہیں کی تو نماز کے لئے مُہرِ
سکوت منہ پر کیوں لگائی جاتی ہے بلکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ
نماز میں وہ اثر اور برکت ہے کہ جب نماز کے لئے جگہ دینے
کی درخواست کی جاتی ہے تو شاذ تو ہر جگہ مستثنیٰ ہوتے ہیں
اور شمار میں نہیں آیا کرتے باقی کہیں نہیں دیکھا کہ کسی نے
ذرا بھی عذر کیا مخالف مذہب والے تک رعایت کرتے ہیں
مگر خود ہی کوئی کچا اور کم ہمت ہو تو کیا علاج ورنہ ریل میں
اچھے خاصے کھڑے ہو کر رکوع وسجود کے ساتھ اور رُخ کی طرف
نماز ہوتی ہے اور اگر کبھی موقع پر واقعی عذر ہو تو وہاں شریعت
نے تنگ نہیں کیا رخصت پر عمل جائز ہے اور بعضے عذر بالخصوص
مستورات کے جو عذر مذکور ہوئے مسائل جاننے سے رفع
ہو جائیں گے۔ ان ہی میں سے ایک عذر پردہ کا ہے کہ بہلی
سے اتر کر نماز پڑھنے سے بے پردگی ہے تو اس کے متعلق
حکم شرعی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسے وقت میں صرف برقع کا
پردہ کافی ہے۔ بہلی کے احاطہ میں رہنا ضرور نہیں اور حجاج
کا نماز ترک کرنا اگر احکام کی عظمت نہ ہونے سے ہو تو اسکا علاج بھی مذکور ہوا کہ
وعیدین مخالفت احکام کی سوچے اور اگر جہاز میں پاکی کا اہتمام
نہ ہونا اس کا سبب ہے تو اس کے متعلق اوّل کوتاہی کے
ضمن میں جہاں بیماروں کا نماز چھوڑ دینا بخیال نجاست بدن
وپارچہ کے مذکور ہے بیان کیا گیا ہے اور اگر یہ حج نفل ہے
اور کسی سبب سے اہتمام نماز کا نہ ہوسکے تو اس شخص کو اس حج کے
لئے سفر کرنا ہی جائز نہیں وہ اپنے گھر رہ کر کام میں لگے۔
وعلیٰ مثلہٖ یحمل ما قال العارف المسعود بکؒ سہ

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید • معشوق درینجاست بیائید بیائید

سہ یعنی عارف مسعود بک نے جو شعر کہا ہے وہ ایسے ہی موقع پر حمل کیا جائیگا ۱۲

ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ تعدیل ارکان واتیان سنن کا اہتمام نہیں کرتے نہ قومہ ہے نہ جلسہ ہے۔ رکوع میں بھی ہیئت مسنونہ پر نہیں قیام بھی قدر قرائت مسنونہ سے کم ہے قرائت میں بھی غلط صحیح کی خبر نہیں۔ نماز کیا پڑھتے ہیں بیگار ٹالتے ہیں۔ ایک حدیث میں ایسے شخص کو نماز کی چوری کرنیوالا فرمایا ہے۔ اور ایک حدیث میں ایک ایسے شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم اس ارشاد کے بعد دیا کہ جا پھر نماز پڑھ لتونے نماز نہیں پڑھی یعنی یہ نماز تیری نہیں ہوئی۔ یہ مسئلہ فقہیہ تو الگ رہا کہ اس کی نماز ہوئی یا نہیں۔ لیکن اگر ہوئی بھی تو وہ بھی ایسی ہی ہوئی جیسی ایک کنیزک لنگڑی لینجی اندھی بہری گونگی اپاہج بیمار ہو اور وہ ایک درجہ میں آدمی تو ہے مگر قابل اس کے نہیں کہ کسی صاحب کمال صاحب جمال صاحب جلال بادشاہ کی نذر میں پیش کی جاسکے اور وہ اسکو قبول کرلے اسی طرح یہ نماز ایک درجہ میں نماز کہلائی جاویگی مگر جب اس کے ارکان جو بمنزلہ اعضاء کے ہیں ناقص ہیں تو وہ قابل اس کے نہیں کہ حق تعالیٰ کی حضور میں قبول ہوسکے یا اعضاء درست ہوں مگر ہیئت مسنونہ پر نہ ہونے سے ایسی ہوگی جیسے تندرست کنیزک خال وخط ناز وادا سے خالی ہو جو بادشاہ کو مطبوع خاطر ہے۔ پس درجہ کمال میں مقبول نہوگی یعنی محبوب نہ ہوگی گو لے لی جاوے۔ اس لئے اس کی تعدیل اور تکمیل ضروری ہے رکوع وسجود وغیرہ کی درستی کے لئے تو خالی ارادہ کافی ہے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔ البتہ قیام بقدر مسنون کے لئے کچھ سورتیں خاص سکھنا ضرور ہوں گی جس کے لئے عم کا سیپارہ حفظ ہونا کافی ہے کہ اس میں سورہ بروج تک طوال مفصل ہے اور لم یکن تک اوساط اور اس سے سورہ ناس تک قصار کہ ان کے یاد کرنے سے مختلف نمازوں میں سنت ادا ہوسکتی ہے اور تصحیح قرآن کے لئے کچھ توجہ کرنا پڑیگی جس کے متعلق اس کے قبل عنوان اصلاح معاملہ بقرآن مجید کے ذیل میں عرض کر چکا ہوں۔ اس کا ملاحظہ فرمانا اس باب میں کافی ہوگا اور جس طرح اپنا قرآن صحیح کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے گھر والوں کی نماز اور قرآن جسقدر نماز میں پڑھا جاتا ہے اہتمام کرکے دُرست کرادیں اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کام میں چند روز صرف کریں تو بہت آسانی سے اس میں کامیابی ہوسکتی ہے غرض اس طرح سے نماز کی تکمیل وتعدیل میسر ہوجاویگی اور بعض بارہ مہینے اچھی خاصی نماز پڑھتے تراویح میں تعجیل کی مشق کرنے لگتے ہیں انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ کسی نمبر میں اسکے متعلق خصوصیت کے ساتھ عرض کیا جاویگا۔

ایک کوتاہی کہ وہ نمازی امراء میں بالخصوص کثرت سے ہے جماعت کا ترک کرنا ہے۔ نصوص سے اسکا حد درجہ اہتمام ثابت ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں اُن پر نظر کرکے بہت علماء نے اس کو واجب کہا ہے اور بعض محققین فقہاء حنفیہ نے بھی اس کو اختیار کیا ہے اور واجب عمل میں اور ترک کے گناہ اور سزا میں برابر فرض کے ہے پس ایک فرض کو ادا کرنا اور اس کے مساوی کو ادا نکرنا یہ کس درجہ کی غلطی ہے اور تتبع سے جہاں تک دیکھا گیا سبب ترک جماعت کا اکثر دو امر ہیں ایک سستی کہ اتنی دُور کون جائے دھوپ میں کون جائے۔ دوسرے تکبر کہ ذلیل لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا یا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا پڑے گی اور کبھی اس کا سبب مسجد میں ان لوگوں کی شان وعادت کے موافق سامان آسائش کا مفقود ہونا ہوتا ہے چنانچہ میں نے ایک صاحب کو یہ عذر کرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں وضو کا موقع ایسا ہے کہ وہاں بیٹھیں تو کپڑوں کو کائی لگ جاتی ہے۔ چٹائیاں سڑی ہوئی جنمیں گرد وغبار بھرا ہوا بچھی ہیں جس سے کپڑے میلے ہوجاتے ہیں۔ ہوا کا گذر نہیں۔ دل پریشان ہوتا ہے۔

سُستی کے متعلق تو اتنا عرض کرنا کافی ہے اگر اسی وقت میں کوئی دُنیا کا کام جسمیں مال وجاہ کا نفع ہو نکل آوے یہی حضرات اس طرح اس کی طرف دوڑیں کہ ذرا بھی کسل

نہ ہو نہ گرانی ہو۔ افسوس کیا آخرت کی ضرورت اس درجہ پر بھی نہ رہی۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ اُن کے دروازے پر مسجد تھی مگر کبھی وہاں تشریف نہ لاتے تھے ایکبار اُن کے یہاں لڑکے کی تقریب بسم اللہ کی تھی اور اُن کے ایک غریب بھائی کسی بات پر اینٹھ گئے تھے عین جیٹھ بیساکھ کے دوپہر میں ایک بچے کی چھتری کہ وہ پورا سایہ بھی نہ کر سکتی تھی لگا کر ان کے پاس ایک دور محلہ میں گئے اور ان کو منا کر لائے۔

یا اللہ! دنیا کی مصلحت کے وقت وہ سستی کہاں چلی جاتی ہے۔ علاج اس کا وہی وعیدوں کا یاد کرنا ہے اور تکبر کے باب میں یہ معروض ہے کہ اول تو آپ کی شان ہی کیا ہے شاید وہ مساکین خدا تعالیٰ کے نزدیک تم سے زائد محبوب و مقبول وذی جاہ ہوں اس کے سامنے دُنیوی عزت گرد ہے بلکہ عجب نہیں کہ قیامت میں تم کو ان ہی مساکین کی التجا کرنی پڑے اور ان کی استدعا سے تمھاری رہائی ہو۔ تو باوجود قیام اس احتمال کے تم کو ان کے حقیر سمجھنے کا کیا حق حاصل ہے دوسرے اگر تمھاری شان ان مساکین سے زائد بھی مان لیجاوے تو تم مساجد میں اُن مساکین کی تعظیم کے لئے تو نہیں بھیجے جاتے کہ خلاف شان ہو بلکہ تم اور وہ سب ایک ایسے عظیم الشان کی تعظیم کے لئے جمع ہوئے ہو جس کی تعظیم سے تمھاری شان بڑھتی ہے کیا کسی بادشاہ کے دربار عام کے موقع پر کوئی شخص محض اس بنا پر حاضر ہو کر سلام کرنے سے اعراض یا اغماض کر نیکی ہمت نہیں کر سکتا کہ وہاں تو غربا بھی جا کر سلام کرتے ہیں اور اُس سلام کے لئے جانا اہانت ہے۔ کیا سچ مچ ایسے دربار کے موقع پر سلام کرنا اہانت ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کیا اگر کوئی ایسا سمجھ کر نہ جائے تو وہ سرکش اور گستاخ نہ سمجھا جاوے گا ضرور ضرور تو تعجب ہے کہ دربار شاہی کے ساتھ تو یہ برتاؤ اور دربار الٰہی کے ساتھ یہ برتاؤ صدق اللہ تعالیٰ۔ ما قدروا اللہ حق قدرہٖ[1] ان اللہ لقوی عزیز۔

اور اگر کسی مسکین کے امام ہونے سے عار آتی ہے تو اول تو وہ عار کی بات نہیں کیا حکام کے درباروں میں حاضر ہونے کے وقت اردلی خاص کہ رتبہ اور ریاست میں تمھاری برابر نہیں پیش کرنیکے وقت تمھارا پیشرو نہیں ہوتا پھر اسوقت نماز کیوں نہیں آتی۔ یہ ساری عار خدا ہی کے معاملہ میں کیوں ہے اصل یہ ہے کہ وہاں تو خوشنودی مقصود ہے وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو۔ اور یہاں یہی مقصود نہیں ورنہ کسی طریق سے بھی عار نہ آتی و للہ در العارف الرومی حیث یقول ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ۔۔۔ اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما ۔۔۔ اے تو افلاطون و جالینوس ما

دوسرے اگر پھر بھی عار ہے تو آپ لیاقت علمی و عملی اُن مساکین سے زیادہ حاصل کیجئے پھر آپ کے ہوتے ہوئے وہ غریب خود ہی امام نہ بنے گا۔ آپ امام بنئے اُس مسکین کو عار نہ آویگی وہ اقتدا کرے گا اور جماعت ہو جاویگی۔ افسوس خود تو الحمد اور قل ہو اللہ بھی صحیح نہ جانتے ہوں اس تک کی خبر نہ ہو کہ سجدۂ سہو کن کن صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے۔ اس لئے تو خود امامت کے قابل نہ ہوں اور جو دوسرا اس قابل ہو اس سے عار کریں یہ عار نہیں نار ؎

زینہار از چنیں تکبر و عار
وقنا ربنا عذاب النار

---

[1] خدا تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رتبہ کیموافق لوگ اسکی قدر نہیں جانتے حق تعالیٰ نہایت قوت والا اور غالب ہے۔ ۱۲

یادِ اندلس

قاضی مُنذِر بن سعید

آئینِ جواں مرداں حق گوئی وبیباکی

ثناء الحق ایم اے

آغاز اسلام سے علماء کا ایک گروہ ایسا رہا ہے جس نے اعلائے کلمۃ الحق کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا اور اس فرض کی ادائگی میں نہ اسنے کبھی تحسین وستائش کی خواہش کی اور نہ کبھی کسی کے جبر واستبداد سے خوف کھایا۔ دراصل اس کو اس معاملہ میں سوائے احکام خداوندی کی بجاآوری کے اور کسی بات کی کبھی پرواہ نہ ہوئی، کیونکہ اس کو یقین تھا کہ عزت وذلت، تکلیف وراحت، موت وزلیست سب اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا اس کے علاوہ نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی حاجت۔

ان علماء کی حق گوئی کو اکثر بڑے بڑے فرمانرواؤں اور عظیم شہنشاہوں نے بھی سراہا اور وہ بھی ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوئے اگرچہ کچھ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ سچ بات کہنے کی پاداش میں بعض بعض علماء کو دار ورسن کا سامنا کرنا پڑا اور کچھ دون فطرت اور ہوا وہوس کے بندے حکمرانوں نے ان حق کی آواز بلند کرنے والوں کو ایذائیں پہنچائیں اور انھیں تکلیفیں دے کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا لیکن بے شمار مثالیں ایسی ہیں جہاں حق سر بلند رہا۔ بعض داعیانِ حق کو فاقوں اور افلاس سے دوچار ہونا پڑا لیکن انھوں نے کبھی زہرِ ہلاہل کو قند نہیں کہا۔

ایسے ہی علماء میں اندلس مرحوم کے ایک فقیہ منذر بن سعید البلوطی بھی تھے۔ مختلف علوم وفنون کے ماہر، بہترین خطیب ومقرر اور بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے نہ کبھی کسی کی مدح سرائی کی اور نہ خوشامد اور چاپلوسی سے کام لیا۔ صرف اپنی لیاقت اور حق گوئی کی بناء پر قرطبہ میں قاضی جماعت مقرر کئے گئے۔ وہ ۲۶۵ھ میں پیدا اور ۳۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ گویا ان کی حیاتِ مستعار کا بیشتر حصہ عبد الرحمٰن الناصر کے دورِ خلافت میں گذرا۔

تاریخ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عبد الرحمٰن الناصر کو اندلس مرحوم کی تاریخ میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کی آٹھ سو سالہ تاریخ اسلامی میں اس رعب ودبدبہ اور شان وشوکت کا کوئی دوسرا فرمانروا نہیں ہوا۔ اس کی فتوحات اس کا نظمِ مملکت اور اس کی شان وعظمت اس کے زمانہ میں بھی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ مشرق ومغرب کا کوئی ہمعصر حکمراں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا اور بڑے بڑے بادشاہ اس سے دوستی قائم کرنے کو اپنے لئے موجبِ فخر ومباہات سمجھتے تھے۔ علماء وفضلاء تک اس کے سامنے بات کرتے ہچکچاتے تھے۔ لیکن قاضی مُنذر بن سعید نے نہ کبھی خلیفہ کے جاہ وجلال سے رعب کھایا اور نہ وہ کبھی اس کے

غصہ یا خفگی کی پروا کی۔ اس کے خلاف انھوں نے اگرکبھی خلیفہ کو کوئی غلط کام کرتے دیکھا تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے منظرِعام پر دربار میں یا کسی اجتماع کے موقع پر ٹوک دیا۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ ان کی رائے کا احترام کرتا تھا۔ ان کے سامنے کوئی خلافِ شریعت کام کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اور کبھی ان کو مجبور نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی خوشنودی کے لئے کوئی غلط فتویٰ دیں۔ چنانچہ اس کے دور کے کئی واقعات تاریخ میں ایسے محفوظ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے نہایت صاف گوئی سے کام لیا اور اگرچہ بعض مواقع پر عبدالرحمٰن کو ان کی بات گراں گذری لیکن نہ کبھی قاضی صاحب نے کوئی معذرت کی اور نہ کبھی خلیفہ نے اپنی وقتی رنجش کی بناء پر ان کو کوئی اذیت پہنچائی۔

قاضی منذر کی قابلیت وعظمت کا احساس خلیفہ کو خصوصیت سے اس وقت ہوا جب قیصرِ روم کے سفراء کی آمد پر ایک شاندار دربار منعقد ہوا اور یہ طے پایا کہ کوئی خطیب کھڑا ہوکر ان سفیروں کو خطبۂ استقبالیہ پیش کرے اور ساتھ ہی خلیفہ کی جلالت شان اور سلطنت کی عظمت وشوکت کا ذکر کرے۔ اس موقع پر امالی کے مصنف ابوعلی القالی عراقی بھی ایسے مرعوب ہوئے کہ چند جملوں سے زیادہ نہ بول سکے۔ ان کے علاوہ کئی اور فضلاء اور مقرروں نے کوشش کی مگر ناکام رہے۔ جب قاضی منذر بن سعید نے یہ حال دیکھا تو انھوں نے کھڑے ہوکر بغیر کسی غور وفکر کے نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی۔ جس کو سن کر مہمان بھی حیران وششدر رہ گئے اور خلیفہ بھی بیحد متاثر ہوا۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

> "یہ شخص واقعی اپنی قوم میں بڑا آدمی ہے اگر غور وفکر کے بعد بھی یہ تقریر کرتا تو کچھ کم قابلِ تعریف بات نہیں تھی چہ جائیکہ فی البدیہہ ایسی تقریر کی جو بجائے خود نہایت عجیب وغریب بات ہے۔"

اس واقعہ سے متاثر ہوکر خلیفہ نے آپ کو بلند مدارج پر فائز کیا۔ پہلے زہراء کی جامع مسجد کا امام اور خطیب مقرر کیا اس کے بعد قرطبہ کا قاضی جماعت اور زہراء کا امام بنایا۔

ان عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بھی قاضی منذر بن سعید میں نہ غرور وتمکنت کا کوئی شائبہ نظر آیا نہ تملق وخوشامد نے ان کے دل میں گھر کیا۔ نہ انھوں نے کبھی خلیفہ کی بے جا تعریف وتوصیف کی اور نہ حق بات کہنے سے انحراف کیا۔ مؤرخین ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ ایک مصنف لکھتا ہے:

> " زمانہ عبدالرحمٰن میں منذر بن سعید قاضی جماعت تھے۔ ان کے عدل وانصاف کا شہرہ ان کی کافی شہادت ہے۔ ظالم کو انھوں نے گرفتار کرایا۔ حقدار کو اس کا حق دلوایا۔ باطل کا قلع قمع کیا۔ نہایت باہمت آدمی تھے انصاف کرنے میں ہرگز بزدلی نہیں دکھاتے۔ الناصر لدین اللہ کے انتقال تک اپنے عہدہ پر قائم رہے اور ان کے بعد الحکم نے بھی ان کو بحال رکھا انھوں نے کئی مرتبہ استعفا بھی دیا مگر منظور نہ ہوا ان کے انتقال کے بعد بھی نہ کسی نے ان کے ظلم کا ذکر کیا۔ نہ کبھی یہ سنا گیا کہ انھوں نے کوئی غلطی کی بڑے عالم تھے۔ حق کلام کہتے تھے اور صدق ظاہر کرتے تھے سنت و ورع اور رد اہل بدعت میں انھوں نے بہت سی کتابیں چھوڑی ہیں وہ خطیب بلیغ اور شاعر تھے۔"

قاضی منذر کے ان کئی واقعات میں سے جو تاریخ میں محفوظ ہیں یہاں نمونے کے لئے چند پیش کئے جاتے ہیں۔

خلیفہ عبدالرحمٰن نے ایک مرتبہ قصر الزہراء کی تعمیر میں انہماک کی وجہ سے متواتر تین جمعوں تک جماعت میں شرکت نہیں کی۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ آیا تو قاضی منذر نے اس کو متنبہ کرنے کے لئے ایسا خطبہ دیا جس میں دنیا کی بے ثباتی و بے بضاعتی کا بھی نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ عمارات میں اسراف کی بھی مذمت ہوگئی تھی۔ موت کے خوف اور زہد کے شوق کی جانب بھی توجہ دلائی گئی تھی اور نفس کشی

کی تلقین بھی تھی۔ غرضیکہ ایسا پُر اثر اور دلنشیں خطبہ تھا کہ تمام حاضرین متاثر ہوئے۔ اکثر لوگ اپنے گناہوں کو یاد کر کے رو پڑے خود خلیفہ پر بھی کافی اثر ہوا۔ وہ بہت رویا۔ اپنے کئے پر شرمندہ ہوا اور خدا کے قہر و غضب سے پناہ مانگی۔ لیکن قاضی صاحب کے اس عمل سے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انھوں نے مجھے لوگوں کے سامنے ذلیل کرنے کے لئے یہ خطبہ دیا ہے۔ لہٰذا اضطراری طور پر یہ قسم کھالی کہ "میں آئندہ کبھی ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا"۔ چنانچہ اس نے جامع مسجد قرطبہ کے بجائے جامع زہراء میں احمد بن قطرف کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھنی شروع کر دی۔

جب اس واقعہ کو کچھ عرصہ گذر گیا تو ایک روز ولیعہد "الحکم" نے خلیفہ سے کہا "جب آپ قاضی منذر بن سعید سے اتنے ناراض ہیں تو انھیں علیحدہ کر کے کسی اور کو اس منصب پر فائز کر دیجئے"۔

منصف مزاج اور مردم شناس خلیفہ نے بیٹے کی یہ بات سُنی تو بجائے اس پر عمل کرنے کے برہمی کا اظہار کیا۔ اور اس کو جھڑک کر کہا:

"اگر کسی وقتی ملال کی بنا پر میں نے ایک عہد کر لیا تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں قاضی منذر کو بُرا سمجھتا ہوں یا ان سے ناراض ہوں میں جانتا ہوں کہ وہ ایک عالم و فاضل شخص اور ایک صاحبِ زہد و ورع انسان ہیں میں انہیں کسی طرح معزول نہیں کر سکتا۔ خواہ تمھیں ولیعہدی سے معزول کر دوں تاکہ وہ نفس جو رشد سے دُور ہو کر غیر مقصود کی طرف جاتا ہی سزا پائے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے خدا تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میرے اور نماز جمعہ کے درمیان میں منذر جیسے باورع و صدق آدمی شفیع نہ ہوں۔ مجھے اس وقت رنج تھا کہ میں نے قسم کھالی۔ مجھے اپنی قسم کا کفارہ دینا آسان ہے۔ جب تک میں اور وہ زندہ

"جب جبّارِ دُنیا کے دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے تو جبّارِ آسمان کو رحم آتا ہے!"

ہیں میں لوگوں کے ساتھ ان ہی کے پیچھے نماز پڑھوں گا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ہم ان سے ناراض نہیں ہیں"۔

باپ کا یہ جواب سُن کر ولیعہد الحکم بیحد شرمندہ ہُوا اور معذرت کرنے لگا۔ اسی وقت خلیفہ نے تمام علماء کو پُر تکلف دعوت دی قاضی منذر کو خصوصیت سے مدعو کیا۔ وہ سب کے بعد آئے اُس وقت اُن کے جسم پر نہایت بوسیدہ لباس تھا۔ خلیفہ نے اصرار کر کے انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہا مگر قاضی صاحب نے یہ کہہ کر اس کے قریب بیٹھنے سے انکار کر دیا کہ:

"امیر المومنین! انسان کو چاہیئے کہ جہاں اس کو مجلس میں جگہ ملے بیٹھ جائے نہ یہ کہ لوگوں کے کندھوں پر سے کودتا پھرے"۔

چنانچہ وہ مجلس کے آخر میں سب کے پیچھے بیٹھ گئے۔

قاضی صاحب کی حق گوئی کا ایک اور واقعہ المقری نے ابن الحسن بناہی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ "خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے ایک قبہ بنوایا تھا اور اس کی چھت میں سونے چاندی کی اینٹیں لگوائی تھیں۔ ایک دن خلیفہ اس قبہ میں اپنے وزراء اور امراء کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنی شان و شوکت پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ خود بھی اس عمارت کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور حاضرین سے بھی

دا دے رہا تھا۔ اسی اثنا میں قاضی منذر بھی سر جھکائے ہوئے آئے۔ جب وہ بیٹھ گئے۔ تو خلیفہ نے ان سے بھی سوال کیا کہ:

"کیا آپ نے مجھ سے پہلے کسی بادشاہ کو دیکھا یا سنا ہے کہ اس نے ایسا مکان بنوایا تھا؟"

قاضی نے یہ بات سنی تو جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگے۔ آنسو آنکھوں سے رواں ہو کر داڑھی پر بہنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد خلیفہ سے یوں مخاطب ہوئے:

"واللہ لے امیر المومنین! مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ شیطان آپ کو یہاں تک پہنچا دے گا۔ خدائے تعالیٰ نے آپکو اپنا فضل نعمت عطا فرمایا ہے اور آپ کو اہلِ دُنیا پر فضیلت دی ہے۔ مگر آپ کافروں کی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

خلیفہ نے اپنے متعلق آخری جملہ سُنا تو اسے فطرتاً کچھ ناگوار ہوا اور کہنے لگا:

"قاضی صاحب! آپ کو کچھ خیال بھی ہے کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ اور مجکو منزل کفار تک پہنچا رہے ہیں۔"

قاضی مُنذر نے جواب دیا:

"میں نے جو کچھ کہا صحیح کہا ہے۔ کیا خدائے تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے لولا ان یکون الناس امۃً واحدۃً ......"

الناصر یہ سُن کر سخت نادم ہوا۔ خوف الٰہی سے اس کے آنسو رواں ہو گئے اور وہ کہنے لگا:

"قاضی صاحب! خدائے تعالیٰ ہماری اور اپنی اور مسلمانوں کی طرف سے آپکو جزائے خیر دے۔ اور آپ جیسے آدمیوں کی ہم لوگوں میں کثرت کرے۔ جو کچھ آپ نے فرمایا بالکل حق ہے۔"

یہ کہہ کر خلیفہ استغفار کرتا ہوا اس مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوا اور حکم دیا کہ فوراً اُس قبہ کی چھت اُتار دی جائے۔ اور سونے چاندی کی اینٹیں نکال دی جائیں۔

تاریخ کی کتابوں میں کئی واقعات نماز استسقاء سے متعلق درج ہیں۔ جن سے قاضی مُنذر کی صاف گوئی اور بے خوفی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ المقری نے لکھا ہے کہ:

"ایک مرتبہ الناصر نماز استسقا کے لئے گیا۔ لوگوں کو اس کے ارادے کی پہلے ہی اطلاع ہو گئی تھی لہٰذا وہ جلد جلد مصلے پر پہنچ گئے۔ قاضی منذر نے ایک شخص سے کہا:

"خلیفہ ایسی جگہ پر آکر کیا کریں گے؟"

اس نے کہا: "بخدا میں نے آج سے زیادہ خلیفہ کو کبھی عاجز و خاشع نہیں دیکھا۔ وہ پہلے آکر چُپ چاپ مصلے پر بیٹھ گئے۔ اُسوقت وہ نہایت ادنیٰ پوشاک زیب تن کئے ہوئے تھے۔ پھر یکایک اُن پر رقت طاری ہو گئی۔ روتے روتے زمین پر لیٹ گئے۔ سر اور داڑھی خاک آلود ہو گئی۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے:

الٰہی! یہ میرا سر تیرے سامنے ہے۔ اور
میرا ماتھا تیرے آستانے پر ہے۔ الٰہی! کیا تو
میرے گناہوں کے بدلے میری رعایا کو عذاب
دینا چاہتا ہے۔ الٰہی! تو احکم الحاکمین ہے۔"

قاضی مُنذر نے یہ باتیں سُنیں تو ان کے چہرے پر شادابی نمودار ہو گئی۔ اور انھوں نے کہا:

"اگر یہ بات ہے تو بارش آیا ہی چاہتی ہے کیونکہ جب جبّارِ دُنیا کے دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے تو جبّارِ آسمان کو رحم آتا ہے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوگ نماز استسقا سے فارغ ہو کر گھر واپس بھی نہیں آئے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور لوگوں کے لئے گھر پہنچنا مشکل ہو گیا۔"

قاضی مُنذر کے ان چند تاریخی واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر زمانہ میں علماء حق کی کیا شان رہی ہے۔ کس طرح انھوں نے کلمۂ حق کہنے میں بے باکی اور جرات سے کام لیا اور کیسے دولتِ حکومت اور جبر و استبداد کی پروا نہ کرتے ہوئے اعلائے کلمۃ الحق کیا۔ درحقیقت یہ اُن ہی قدسی نفس انسانوں کا فیض ہے کہ دینِ متین بہت سے نامساعد حالات اور ادوار سے گذرنے کے بعد اپنے اصولوں کو آج تک قائم رکھے ہوئے ہے!

اللہ ان مردانِ حق آگاہ و حق گو کی تربتوں کو منوّر رکھے جنھوں نے دین کی ہر زمانہ میں حفاظت کی اور حق کی آواز کو ہمیشہ بلند کیا۔ ٥

قائد اعظم کے بارے میں ناشائستہ اندازِ بیان پر پچھلے دنوں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ہمارے ہاں موضوعِ گفتگو بنے رہے ہیں، لیکن انھوں نے ہماری قومی جدّوجہد کی تاریخ کس طرح بیان کی ہے؟ یہ بات دب کر ہی رہ گئی، جناب احمد سعید ایم اے جو تاریخ پاکستان کے ایک اسکالر ہیں، اس پہلو کے کچھ گوشے سامنے لائے ہیں۔

احمد سعید ایم اے تاریخ، ایم اے پولیٹیکل سائنس، لیکچرر ایم اے او کالج، لاہور۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی

ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک ہماری تحریک آزادی کی کوئی مستند کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کچھ کتابیں تحریر کی گئی ہیں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب ہماری قومی جدّوجہد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک مشہور ادیب، سیاسی کارکن اور افسانہ نویس رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے علماء کے ضمن میں اپنی اس کتاب میں چند ایک باتیں ایسی کہی ہیں جن کا تعلق افسانہ نویسی سے تو ہو سکتا ہے تاریخ سے ہرگز نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ان باتوں کا تاریخی جائزہ لینا نہایت ضروری ہے کیونکہ علماء کے خلاف پہلے ہی غلط قسم کے واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ ایک تاریخ داں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار رہے اس کی تحریروں میں اس کے جذبات کو بالکل دخل نہ ہو۔ جو بات کہے حوالہ جات کے ساتھ بیان کرے، افسانہ نویسی سے احتراز کرے، جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تاریخ نویسی کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ واقعات بیان کرنے میں پوری دیانت برتی جائے۔ البتہ واقعات کی تاویل اور توجیہات اور تعبیر اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے"۔[1] لیکن نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود تاریخ کے اس مسلمہ اصول کو مجروح و پامال کیا اور شاید وہ تاریخ لکھتے لکھتے اکتا گئے ہوں اور راستہ میں انھوں نے افسانہ نویسی شروع کر دی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر ایسی باتیں کہہ گئے جن کا تاریخی ثبوت میسر نہیں۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "کوئی مانے نہ مانے یہ حقیقت

---

[1] ہماری قومی جدوجہد، عاشق حسین بٹالوی، لاہور۔ ص: ۱۲

ہے کہ جناح مسلمانوں کا پہلا سیکولر (SECULAR) لیڈر تھا جس جس نے ہماری سیاست کو ہمیشہ مولویوں سے نجات دلائی سر سید مرحوم بھی سیکولر لیڈر تھے۔ لیکن ان پر جب مولویوں نے کفر کا فتویٰ لگا کر انھیں واجب القتل قرار دیا اس غریب کو بھی جان بچانے کے لئے اور مولویوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے ان ہی کے ہتھیار استعمال کرنے پڑے"۔ [۵۲]

اپنی اس تحریر میں ڈاکٹر صاحب نے دو غیر مستند تاریخی باتیں بیان کی ہیں۔ پہلی یہ کہ "جناح مسلمانوں کا پہلا سیکولر لیڈر تھا" سیکولر کا مطلب اگر یہ ہے کہ جناح مذہب اور سیاست کو علیحدہ تصور کرتے تھے۔ یا جناح ایک غیر مذہبی حکومت کے خواہاں تھے تو یہ بات تاریخی طور پر بالکل غلط ہے قائد اعظم کی تقاریر میں کسی جگہ بھی اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ وہ سیاست کو مذہب سے جدا خیال کرتے تھے۔ بلکہ جگہ جگہ انکی تقریروں میں آتا ہے: "ہمارا پاکستان کے مطالبہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقوں میں اسلامی تعلیمات کے مطابق آزادی کی فضا میں زندگی گذارنے کا حق حاصل ہو" [۵۳] فرماتے ہیں: "نہ میں کوئی مولوی ہوں نہ مجھ کو دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کا مطالعہ اپنے طور پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں"۔ [۵۴] آئین کے متعلق فرمایا: "پاکستان کا دستور ابھی اسمبلی نے تیار کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس کی شکل کیا ہوگی لیکن یہ ایک جمہوری آئین ہوگا۔ جس میں اسلام کے بنیادی اصول شامل ہوں گے۔ یہ اصول آج بھی زندگی میں اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح آج سے ۱۳۰۰ برس پہلے تھے اسلام نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔" فرمایا "ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن صرف اخلاقی اور مذہبی اصولوں تک محدود نہیں بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے" [۵۵]

دوسری بات جو ڈاکٹر صاحب نے جو بیان کی ہے کہ مولویوں نے واجب القتل قرار دیا۔ مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علماء اور کم علم مولویوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں برتی۔ ان کی اس تحریر سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ تمام مولوی جن میں علماء بھی شامل تھے، تمام لوگ سر سید کو کافر سمجھتے تھے۔ اور انھوں نے سر سید کے قتل کا فتویٰ دیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام جید علماء جنہیں حضرت مولانا امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی مولانا محمد قاسمؒ بانی دار العلوم مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ شامل ہیں کبھی بھی سر سید مرحوم کو کافر قرار نہیں دیا۔ مگر ان تمام اصحاب کو سر سید کے طریق کار سے اختلاف تھا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک خط سر سید مرحوم کو تحریر کیا جس کا مسودہ حضرت مولانا تھانویؒ نے تیار کیا تھا اس خط میں بھی یہ بات مذکور رہے کہ "جہاں تک آپ کی مساعی و تصانیف کو غور کر کے دیکھا تو یوں معلوم ہوا کہ دو چیزیں آپ کے مقصود ہیں خیر خواہی اسلام اور خیر خواہی مسلمانان نے اس پر مجبور کیا ہے کہ جو اعتراضات مذہب اسلام پر مخالفین کرتے ہیں ان کے جواب دیئے جائیں اور خیر خواہی مسلمانان اس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو تنزل میں گرے جا رہے ہیں ان کو ترقی تک پہنچایا جائے۔ ان دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی کو کلام نہیں مگر غور طلب بات یہ ہے کہ اس کے ذرائع و وسائل کیا ہیں" [۵۶]

سر سید نے جس وقت علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تو ایک خاص معتمد کو مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس بھیجا کہ میں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک کالج کی بنیاد ڈالی ہے اگر آپ میرا ہاتھ بٹائیں تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گا۔ مولانا نے سر سید کا یہ پیغام سن کر کہا "بھائی ہم تو آج تک مسلمانوں کی کامیابی

---

۵۲ ہماری قومی جدوجہد، عاشق حسین بٹالوی لاہور ص: ۷۱

۵۳ حیات قائد اعظم، سردار خالد اختر، بمبئی۔ ص: ۵۰۷

۵۴ حیات قائد اعظم، سردار عزیز۔ لاہور۔ ص ۲۷۴

۵۵ جناح کی تقاریر (انگریزی) جمیل الدین احمد، لاہور۔ ص ۴۰۵

۵۶ حیات اشرف۔ عبد الرحمٰن، ملتان۔ ص ۱۸۷

فلاح وبہبود کا زینہ اللہ اور رسولؐ کی اتباع میں سمجھتے رہے مگر آج یہ معلوم ہوا کہ ان کی ترقی کا کوئی اور بھی زینہ ہے تو اسکے متعلق یہ عرض ہے کہ میری ساری عمر قال اللہ وقال رسولؐ میں گذری ہے، مجھے ان چیزوں سے زیادہ نسبت نہیں"۔ مولانا قاسمؒ کا نام لیا کہ ان سے بلو۔ وہ ان باتوں میں مبصر ہیں جو وہ فرمائینگے ہم ان کی تقلید کریں گے۔ جب یہ سفیر مولانا قاسم کے پاس پہنچے تو مولانا قاسم نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ کام کرنے والوں کی تین قسمیں ہیں ایک نیت اچھی ہے تو عقل نہیں ہے۔ اگر عقل اچھی ہے تو نیت اچھی نہیں ہے۔ تیسرے نہ نیت اچھی نہ عقل اچھی۔ سرسید کے متعلق ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نیت اچھی نہیں مگر عقل نہیں ہے کیونکہ جس زینے سے مسلمانوں کو ترقی کی معراج پر لے جانا چاہتے ہیں وہی مسلمانوں کی تنزل کا سبب ہوگی"۔ [7]

جب کچھ مولویوں نے سرسید کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کیا تو مولانا محمد قاسمؒ صاحب کے پاس بھی پہنچے تو انھوں نے فرمایا کہ میں دیکھ لوں کہ آیا کافر ہے بھی یا نہیں۔ چنانچہ تین سوالات سرسید کو لکھ کر بھیجے۔

۱۔ سوال: خدا پر آپ کا عقیدہ کیا ہے

جواب: خداوند تعالیٰ ازلی ابدی مالک وصانع تمام کائنات ہے۔

۲۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا عقیدہ ہے۔

جواب: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

۳۔ سوال: قیامت پر آپ کا عقیدہ کیا ہے۔

جواب: قیامت برحق ہے

ان جوابات کے بعد مولانا قاسم نانوتویؒ نے ان لوگوں سے فرمایا "تم اس شخص کے خلاف مجھ سے دستخط کروانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے"۔ [8]

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: "سرسید کی نیت تو بری نہ تھی مسلمانوں کا ہمدرد تھا مگر عقل دین کی کمی کی وجہ سے جو راہ مسلمانوں کے فلاح وبہبود کی نکالی وہ مضر ثابت ہوئی"۔ فرمایا: "عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ سرسید کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی بہت ہی دھن تھی اس معاملہ میں بڑی دلسوزی تھی کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی اس صفت پر فضل فرمادیں۔ فرماتے سرسید کا عقیدہ توحید ورسالت کے متعلق جس قسم کا بھی تھا نہایت پختہ اور بلا وسوسہ تھا۔ جیسا کہ ان کی بعض تصانیف سے مجھ کو ظاہر ہوا اور قرآن وحدیث کی جو توجیہات اور تاویلات انھوں نے کیں اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوسکے۔ گو اس کا جو طرز انھوں نے اختیار کیا وہ غلط تھا اسی لئے میں ان کو نادان دوست کہتا ہوں"۔ [9]

فرمایا: "بڑے حوصلے کا آدمی تھا مگر اس نے خواہ مخواہ دین میں ٹانگ اڑا کر اپنے آپ کو بدنام کیا ورنہ تمام لوگ اس کو دنیا کا پیشوا ضرور بنا لیتے بڑا محب قوم تھا"۔ [10]

چنانچہ مندرجہ بالا شواہد سے یہ ثابت ہوا کہ تمام جید علماء نے کبھی بھی سرسید کو کافر قرار نہیں دیا۔ البتہ ان کے طرزِ عمل سے تمام علمائے نے اختلاف کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں" جناح کفر کے فتووں سے بے نیاز ہی نہیں بلکہ بالاتر تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس نے مولویوں کے اکھاڑے میں اترنے سے انکار کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے پیشہ ور مولوی جن میں بڑے بڑے تھانوی بڑے بڑے عثمانی، بڑے بڑے ندوی اور بڑے بڑے مدنی شامل تھے اس کا بال بیکا نہ کرسکے انجام کار دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ بڑے بڑے حاملان شرع متین

---

[7] الافاضات الیومیہ۔ جلد چہارم۔ تھانہ بھون۔ ص: ۲۷۴

[8] مقالات یوم شبلی۔ عبید اللہ۔ لاہور ۱۹۶۱ء ص: ۶۹

[9] اشرف السوانح۔ مجذوب۔ لاہور ص ۲۱۴

[10] جدید ملفوظات دہلی۔ ص: ۲۳

بڑے بڑے مدعیانِ زہد و ورع، بڑے بڑے اہلِ جبہ و عمامہ اور بڑے بڑے زبدۃ العارفین و قدوۃ السالکین کو گردن جھکا کر جناح کے پیچھے چلنا پڑا۔"[۱۰]

ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا پیراگراف بالکل جذبات میں بہہ کر لکھا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہیں کہ انھوں نے جن "بڑے بڑے پیشہ وروں" کے نام لکھے ہیں صرف ان میں سے ایک پیشہ ور مولوی (حضرت مولانا) تھانوی کے متعلق یہ تحریر کر دیا جائے کہ انھوں نے اپنی کتابوں کے حقوق اپنے نام محفوظ نہیں کروائے اور اس طرح لاکھوں روپے کی رائلٹی سے محروم رہے۔ اور کتابوں کی تعداد بھی ایک ہزار سے زائد ہے اگر یہ پیشہ ور کسی قسم کے لالچی اور حریص ہوتے اور مذہب کو اپنا پیشہ بناتے تو شاید اس قسم کی غلطی ہرگز ہرگز نہ کرتے۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہیں کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں علماء نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے جن "بڑے بڑوں" کے نام لکھے ہیں ان میں صرف مولانا حسین احمد مدنی اس وقت تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔ باقی تمام حضرات نے پاکستان کی حمایت کی۔ اور جناح (قائدِ اعظم) کی قیادت کو مسلمانوں کے لئے باعثِ نجات تصوّر فرماتے تھے۔ ان تمام حضرات نے نہ تو کبھی جناح کی مخالفت کی نہ ہی جناح (قائدِ اعظم) کے پیچھے چلنے پر مجبور ہوئے مولانا اشرف علی تھانویؒ خود ڈاکٹر صاحب اور قائدِ اعظم سے زیادہ کانگریس کے مخالف تھے۔ وہ مسلمانوں کو کانگریس میں داخل کرنے یا کرانے کو مسلمانوں کی شرعی موت کے مترادف سمجھتے ہیں"۔[۱۱] ان کو مسلم لیگ کی حمایت پر قتل کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔[۱۲] یہ وہی بڑے تھانوی ہیں جو گاندھی کو شاطر، عیار، چالاک۔ دجال اور طاغوت کے خطابات سے یاد کرتے ہیں۔[۱۳] یہ وہی تھانوی ہیں جو ایک علیحدہ مسلم حکومت کی دعا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں "میری دلی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت عادلہ مسلمہ قائم فرمائے۔ اور میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں"۔[۱۴] یہ بھی یاد رہے کہ یہ خواہش ۷، ستمبر ۱۹۳۸ء کو کی جا رہی ہے۔ جبکہ مسلم لیگ نے ابھی مطالبہ شروع نہیں کیا ہے۔ جناح سے باقاعدہ خط و کتابت جاری ہے۔ ان کو مشورے دیے جا رہے ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں وفود بھیجے جا رہے ہیں۔ تبلیغی وفود تھانہ بھون سے بمبئی اور دہلی جا رہے ہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ ۱۹۳۸ء میں وفد بھیجا جاتا ہے۔ اور وہاں اسی بڑے تھانوی کا ایک پیغام پڑھ کر سُنایا جا رہا ہے اور اسی پیغام کو لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔[۱۵]

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس اپریل ۱۹۴۳ء میں منعقد ہوتا ہے لیگ کی طرف سے دعوت نامہ آتا ہے کہ آپ اجلاس میں شرکت فرمائیں۔ اور "دعا فرمائیں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دل کو مسحور کرے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے"۔

جواب میں ارشاد فرماتے ہیں "باقی دعا ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے کروں گا"۔[۱۶] قائدِ اعظم کو پکا مسلمان تصوّر کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور اس کی تصدیق یوں کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے "بڑا مولوی"۔ ۱۶ / مئی ۱۹۳۹ء کو لاہور میں لکھی گئی اور اس میں ان علماء پر طنز کیا گیا جو متحدہ قومیت کے حامی ہیں۔ فرمایا ؎

وطن جس کی رو سے ہے بنیادِ ملّت
میں اس شرع کی کر رہا پیروی ہوں
سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا
میں اس مدرسہ کا بڑا مولوی ہوں
مجھے لیگ سے اس لئے دشمنی ہے
وہ عبد النصاریٰ میں عبد القوی ہوں
سمجھ لوں میں جینا کو کیونکر مسلماں
کوئی میں بھی اشرف علی تھانوی ہوں[۱۷]

---

[۱۰] ہماری قومی جدوجہد ص: ۷۲

[۱۱] افادات اشرفیہ۔ مفتی محمد شفیع۔ سہارنپور ص: ۸۸ [۱۲] الافاضات[۱۲]

[۱۳] اسعد الابرار۔ ابرار الحق حقی۔ لکھنؤ۔ ص: ۱۳۷

[۱۴] طلوع اسلام دہلی۔ فروری ۱۹۳۹ء [۱۶] افادات اشرفیہ ص: ۹۸

[۱۵] انوار النظر (سوانح مولانا ظفر احمد تھانوی) لاہور ص: ۸۰

[۱۷] چمنستان ظفر علیخاں لاہور ۱۹۴۴ء

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نے نہ صرف پاکستان کی تائید کی بلکہ پاکستان بننے کے متعلق ۱۹۴۳ء میں اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل پیشگوئی بھی فرمادی تھی کہ پاکستان انشاء اللہ ۱۹۴۷ء میں بن جائیگا۔[۱۸] چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے اس بڑے حضرت تھانوی کی وفات پر انکے گزشتہ روابط و خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پاس کی جسمیں ان کو انکی شاندار خدمات میں زبردست خراج تحسین پیش کیا تھا۔ یہ قرارداد ۱۴ نومبر ۱۹۴۳ء کو پاس کی گئی "آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے۔ مولانا مرحوم ایک جید عالم اور اسلام کے زبردست مفسر تھے۔ انھوں نے سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں اور لاکھوں لوگ ان کے مرید تھے۔ اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں جو خدمات انھوں نے سرانجام دیں ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ ان کی وفات کا اس وجہ سے مزید دکھ ہے کہ مولانا کی تائید اور حمایت مسلم لیگ کے لئے بہت مددگار ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے لیگ نے ان خود غرض اور گمراہ طاقتوں کا مقابلہ کیا جو مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں یہ کونسل خداوند کریم سے عاجزی سے دعا کرتی ہے کہ مولانا مرحوم کی روح کو ابدی سکون حاصل ہو اور ان کی روح بدستور مسلمانوں کی راہنمائی کرتی رہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی سالمیت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یہ کونسل مولانا مرحوم کے خاندان، ان کے بے شمار خلفاء اور لاتعداد مریدوں کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔"[۱۹] قرارداد میں مولانا تھانوی کے نام کے آگے "حضرت مولانا" کے الفاظ ان کی کسی عقیدت مند کے نہیں ہیں بلکہ مسلم لیگ کے ممبران کے ہیں جنھوں نے نہایت دیانتداری سے تسلیم کیا کہ مولانا تھانوی کی تائید مسلم لیگ کے لئے مددگار ثابت ہوئی۔

جہاں تک "بڑے بڑے عثمانی" کا تعلق ہے دو اصحاب ہی عثمانی ہیں، ایک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے مولانا ظفر احمد عثمانی دامت برکاتہم۔ یہ دونوں حضرات تحریک پاکستان کے نامور کارکن رہ چکے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے خیالات کا اندازہ ان کے خطبات اور تحریرات سے ہی ہو سکتا ہے۔

بڑے عثمانی (مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) کو شاید ان کی تحریک پاکستان کے سلسلہ میں گزشتہ خدمات کے صلہ میں نئی مملکت اسلامیہ کی پرچم کشائی کی رسم کی ادائیگی کے لئے اعزاز بخشا گیا تھا۔ اور ڈھاکہ میں دوسرے بڑے عثمانی (مولانا ظفر احمد عثمانی دامت برکاتہم) کے ہاتھوں پرچم کشائی کی رسم ادا کرائی گئی۔[۲۰]

سلہٹ اور سرحد ریفرنڈم کے سلسلہ میں ان بڑوں نے جو کام سرانجام دیا اس کے لئے شاید پرانے اخبارات کی فائلیں گواہ ہیں۔ لیاقت علی خاں اور کاظمی الیکشن میں "بڑے عثمانی" (ظفر احمد عثمانی) نے جو کردار ادا کیا اس کا اندازہ اس خط سے ہی ہو جاتا ہے جو لیاقت علی نے اس "بڑے عثمانی" کو لکھا۔ "مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں اللہ پاک نے ہمیں بڑی نمایاں کامیابی عطا کی اس سلسلہ میں آپ جیسی ہستیوں کی جدوجہد بڑی باعث برکت ثابت ہوئی۔ آپکی تحریروں اور تقریروں اور مجاہدانہ سرگرمیوں نے باطل کے اثرات بڑی حد تک ختم کر دیئے ہیں"۔[۲۱]

قائد اعظم کے متعلق ان "بڑے عثمانی" کے کیا رجحانات تھے۔ ان کا اندازہ اس قرارداد سے ہوتا ہے جو کہ اس "بڑے عثمانی" (ظفر احمد عثمانی) کی زیر صدارت محمد علی پارک کلکتہ میں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں پاس کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا "ملت اسلامیہ کی تنظیم اور مدافعت کے لئے اور اس کے استقلال کے لئے مسلم لیگ اور اس کے صدر محترم محب ملت محمد علی جناح کی یہ خدمات تاریخی حیثیت حاصل کر چکی ہیں اور یہ

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

[۱۹] مسلم لیگ کی قرارداد ۱۴ نومبر ۱۹۴۳ء

[۲۰] انوار النظر۔ ص: ۸۰

[۲۱] 〃 〃 ص: ۶۱

خلفائے راشدین کا وصف

ملا واحدی

اہل اقتدار کا اقتدار ختم ہوجاتا ہے تو پھر کوئی ان کا نام لیوا نہیں ہوتا یہ کیا ماجرا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے کو تقریباً چودہ سو برس گذر چکے ہیں، ان کے نام آج تک لئے جاتے ہیں۔ وہ بھی تو حکمراں اور بادشاہ تھے اور کسی حکمراں اور بادشاہ کی اتنی عزت کیوں نہیں کی گئی اور کسی حکمراں اور بادشاہ سے اتنی محبت کیوں نہیں ہوئی۔ بادشاہ محبت سے تو یکسر محروم ہیں بصرف حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک حکمراں ہیں جنھیں خلفائے راشدین کی طرح سراہا جاتا ہے۔ لیکن خلفائے راشدین کی سی عالمگیر شہرت انھیں بھی حاصل نہیں ہے۔ خاص خاص لوگ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے واقف ہیں۔ اور خلفائے راشدین کو مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور غیر مسلم بھی جانتے ہیں۔ گاندھی جی جب کہتے تھے یہی کہتے تھے کہ میں عمر جیسے حکمراں چاہتا ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حکمرانی کا ہر تاریخ داں معترف اور قائل ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی۔ یورپین ہو یا ایشیائی۔

یہ خلفائے راشدین کا ڈنکا کیسے بجے جارہا ہے۔ حکمرانوں اور بادشاہوں کا ملک پر اور ملک کے رہنے والوں پر تسلط ہوتا ہے قلوب پر تسلط نہیں ہوتا۔ خلفائے راشدین کا تسلط اپنوں بیگانوں سبھوں کے قلوب پر ہے۔ یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ کیا خلفائے راشدین اتنے بڑے سیاستداں تھے کہ ایسا سکہ جما گئے کہ مٹائے نہیں مٹتا۔ اور کس کس بڑے سیاستداں کا سکہ چل رہا ہے ذرا بتائیے تو کون کون سا بادشاہ جم جاہ اور کون کون سا وزیر باتدبیر آپ کو یاد ہے۔ میں نے بچپن میں انگریز وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کا چرچا سنا تھا۔ پھر اس کے جانشینوں کی لنگتار دیکھی، کیسی عارضی نکلی، ان سب کی دھاک۔ چرچل تو کل وزیر اعظم تھے اور عظیم ترین وزیر اعظم تھے۔ مگر اب کہیں پرسش نہیں ہے۔ کتنے والس رائے کا ہندوستان میں غل مچا۔ فقط لارڈ مونٹ بیٹن کا ذکر کبھی کبھار آجاتا ہے۔ باقی گورنر جنرل اور وائسرائے نسیاً منسیا ہوگئے۔ مونٹ بیٹن کا ذکر بھی اچھائی کے ساتھ نہیں آتا۔ خلفائے راشدین میں کیا وصف تھا کہ چودہ سو برس گذر جانے کے باوجود ان کا ذکر اچھائی ہی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انھیں افضل البشر بعد الانبیاء مانا جاتا ہے۔ بادشاہ اور افضل البشر بعد الانبیاء۔ وصف یہ تھا کہ انھوں نے سیاست حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھی تھی ان کی سیاست نعوذ باللہ چالاکی کی سیاست نہیں تھی۔ انکی سیاست اسلامی سیاست تھی۔ ان کی سیاست عین اسلام تھی۔ اسلامی کارخانے کے تمام چھوٹے بڑے پرزوں کو بقائے دوام عطا کیا گیا ہے۔ جنید وشبلی، شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی پرزے تھے اور خلفائے راشدین اسلامی کارخانے کی مکمل مشین تھے اسلامی سیاست آج بھی جو اختیار کرے گا اس کا نام مدتوں دلوں پر نقش رہے گا۔ میکاولی سیاست جس قدر ناپاک ہے اسلامی سیاست اسی قدر پاک ہے۔ بقا پاکی کو ہے ناپاکی کو نہیں ہے۔

مسلمانوں کا چالاکی کی سیاست میں ماہر ہونا مشکل ہے مسلمانوں کی گھٹی میں اسلام کی رمق باقی رہتی ہے۔ یا تو اس رمق کو بھی باہر کردیا جائے یا از سر نو ولیا مسلمان بنا جائے، جنھیں بشارت دی گئی تھی کہ گھبراؤ نہیں۔ اور خوف مت کھاؤ، غالب

تم ہی رہو گے بشرطیکہ تم مسلمان ہو" لَاتَهِنُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔" مسلمان ہونے کی شرط پر غور کر لیجیے۔ خطاب حقیقی مسلمانوں سے ہے نام کے مسلمانوں سے نہیں ہے۔ آپ اگر اپنے نفس کی خاطر بے چین ہیں تو بے چینی اور بڑھے گی اور اللہ کے دین کی خاطر بے چین ہیں تو یقین کیجئے اللہ فلاح و کامیابی کی وہ راہیں کھولنے والا ہے کہ آپ کو ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ مسلمانوں کو موقعوں پر موقعے دے رہا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ اس قسم کا وقت آجائے کہ اللہ موقعے دینا موقوف کر دے لیکن ہماری بداعمالیاں نہ رکیں تو اس قسم کا ایک دن آئے گا قطعی۔

اللہ کے وجود اور اللہ کے معبود اور اقتدارِ اعلیٰ ہونے پر ایمان رکھنا، نیک عمل کرنا، یعنی اللہ کے قوانین پر چلنا اور مکافاتِ عمل اور یوم حساب کو ماننا، ان سب باتوں کی بابت بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ان کا اجر دیا جائے گا۔ انسان مرنے کے بعد خائف نہیں ہو گا اور ہاتھ نہیں ملے گا کہ ہائے ہائے میں نے اللہ پر ایمان کیوں نہ رکھا، نیک عمل کیوں نہ کیا اور یوم آخرت کو کیوں نہ مانا، خواہ وہ انسان مسلمان ہو یا حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل کا سچا یہودی، سچا نصرانی، سچا صابی (دیکھئے سورۂ بقرکی ۶۲ ویں آیت)

دنیا میں بھی ایسا انسان خوف و حزن سے مامون رہتا ہے آپ کسی صاحبِ ایمان کا غیر صاحبِ ایمان سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے انشاءاللہ ہر طبقے کے صاحبِ ایمان کو اس طبقے کے غیر صاحبِ ایمان کی نسبت مطمئن پائیے گا۔ باقی یہ خیال غلط ہے کہ ہمارا فلاں نسل سے تعلق کافی ہے ہم فلاں کی اولاد ہیں، ہم خواہ کچھ کریں، ہیں قطعی جنتی۔ یہ خیال یہودیت اور نصرانیت کی پیداوار ہے۔ مسلمان تو نیک عمل کر کے اور اللہ کے قوانین پر چل کر اللہ کے رحم و کرم کی دعائیں مانگتے ہیں نجاتِ اُخروی اللہ کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ نیک عملی کی توفیق خود بہت بڑی عنایت ہے۔ اسی عنایت کے دوام اور اِزدیاد کے لئے ہمہ وقت دست بدعا رہنا چاہیئے۔ ●

اختر راہی

عہدِ عالمگیری کا ایک مفسر و فقیہہ

نام ونسب:

شیخ احمد جیون بن ابی سعید بن عبد اللہ بن عبد الرزاق بن خاصہ بروز سہ شنبہ ۲۵ شعبان ۱۰۴۷ھ کو لکھنو کے قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد مخدوم خاصہ امیٹھی کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ مُلا جیون کی والدہ شاہ عالمگیر کے داروغہ مطبخ (میر آتش) عبد اللہ عرف عزت خان امیٹھوی کی ہمشیر تھی۔ مؤلف تذکرہ علمائے ہند کے بیان کے مطابق خاندانِ صدیقی رح کے چشم و چراغ تھے اور حنفی المسلک۔[1]

تعلیم وتعلم:

ملانے ابتدائی زندگی امیٹھی ہی میں گذاری۔ سات سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کرلیا۔ اور بقول خود اگرچہ قواعد تہجی اور اعراب سے واقف نہ ہوئے تھے تاہم الفاظ جلے اور منقوط کو صحت سے ادا کر لیتے تھے۔[2] حفظِ قرآن کے بعد اپنے دور کے معروف علمائے سے علوم متداولہ کی تحصیل کی اور مُلا لطف اللہ کوڑہ جہان آبادی سے فاتحہ فراغ پڑھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے اور طلبہ کو درس دینے لگے طلبہ پروانہ وار انکے حلقہ درس میں شریک ہوا کرتے اور فیض اٹھاتے۔

حافظہ:

مُلا صاحب کا حافظہ انتہائی قوی تھا۔ ایک بار کوئی قصیدہ سن لیتے تو پورا یاد ہوجاتا۔ درسی کتابوں کی عبارت بغیر دیکھے پڑھتے تھے۔[3]

زیارت حرمین:

چالیس سال کی عمر میں اجمیر اور دہلی میں قیام پذیر رہے یہاں بھی شغل تدریس جاری رکھا۔ سینکڑوں طلباء نے اکتساب فیض کیا۔ پچپن سال کی عمر میں پہلی بار زیارتِ حرمین کیلئے

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۵

[2] سوانح خودنوشت (ملاجیون) بحوالہ الفرقان۔ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ

[3] بزم تیموریہ ص ۲۲۷

روانہ ہوئے۔ قدرے دکن میں ٹھہرے۔ تقریباً پانچ سال حرمین شریفین میں گزارنے کے بعد دکن واپس آئے۔ اورنگزیب عالمگیر دکن کے سنگ ستانوں میں کوہ نوردی کر رہا تھا۔ اسی دور میں ملا صاحب کا تعلق شاہی فوج سے ہوا اور یہیں عالمگیر سے استادانہ تعلقات قائم ہوئے۔ عالمگیر نے ان سے کئی کتابیں پڑھیں اور عمر بھر ان کا احترام کرتا رہا۔ ان سے فرزندوں کی طرح پیش آتا تھا۔ ملا صاحب کی سادہ لوحی اور عالمگیر کی سعادت مندانہ اطاعت گذاری کے قصے اور لطیفے آج بھی مجلسوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔ [۴]

حج ثانی:

اس دور میں یہ خیال پیدا ہوا کہ والدین کی طرف سے حج بدل کیا جائے۔ والد ابو سعید کو خواب میں دیکھا جو حج کے طلبگار تھے۔ آخر ۱۱۱۲ھ میں عالمگیر کی بادل ناخواستہ اجازت حاصل کر کے دوبارہ زیارت حرمین سے مشرف ہوئے۔ اسوقت ان کی عمر ۶۶ سال کے لگ بھگ تھی۔ تین سال کے بعد دکن واپس آئے اور آخر ۱۱۱۶ھ میں وطن کو مراجعت کی۔

دو سال وطن میں مقیم رہے۔ محمد معظم بادشاہ کے جلوس کے پہلے سال ۲۵ محرم ۱۱۱۹ھ کو طلبہ اور عقیدت مندوں کے ایک انبوہ کثیر کے ساتھ دہلی کا سفر اختیار کیا۔ صفر کے آخر میں چہارشنبہ کو دہلی پہنچے۔ بادشاہ معظم موجود نہ تھا۔ دکن سے واپس آتے ہوئے اجمیر میں ان سے ملاقات ہوئی اور بادشاہ باصرار انھیں اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ اور مُلّا صاحب نے انتقال شاہ کے بعد دہلی کو مراجعت کی۔

قیام شاہ جہاں آباد (دہلی) کے دوران میں شاہ فرخ سیر بادشاہ غازی ابو المظفر معین الدین سے ملاقات ہوئی

اور اس ملاقات کے طفیل اہل وطن کی ہر ممکن حاجت براری کی۔

سانحۂ ارتحال:

شروع ماہ ذیقعد ۱۱۳۰ھ سے ہی ملا صاحب نے اپنے سانحۂ ارتحال کی اطلاع دینا شروع کر دی تھی اور وطن مولود ہی جا کر فوت ہونا چاہتے تھے۔ لیکن قضا و قدر کی مصلحت اسکے خلاف تھی۔ ۸ ذی قعد بروز دوشنبہ حسب عادت و معمول طلبہ کو درس دیا۔ دیگر معمولات بھی بخیر و خوبی انجام دئے۔ نصف شب گذرنے پر سینے میں کچھ سوزش سی محسوس ہوئی جو بڑھتے بڑھتے پہلو میں بھی ہونے لگی۔ مُلّا عبد القادر قریب ہی تھے، انھیں بُلا کر بتایا کہ وقت آخر قریب ہے اور یہ کہہ کر جامع مسجد کے جنوبی دالان میں جا کر لیٹ گئے کلمۂ طیبہ ورد زبان تھا کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ملا عبد القادر لکھتے ہیں کہ شام کو ایک شہاب ثاقب دیکھ کر کہنے لگے کہ آج کوئی بہت بڑا عالم و فاضل اس جہاں سے رخصت ہونیوالا ہے [۵]

۹ ذی قعد ۱۱۳۰ھ کو تکیہ میر محمد شفیع میں امانتاً سپرد خاک کئے گئے اور ۱۴ محرم ۱۱۳۱ھ کو میت کو ایک تابوت میں رکھ کر امیٹھی لایا گیا اور وہاں قدیم مدرسہ اسلامیہ کے ملحق قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ شیخ تابع محمد بن ملا مرکھی جو آپ کے استاد زادے اور شاگرد بھی تھے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ وفات کہی ؎

محیط علم آں مولائے اعظم | باحمد عرف جیون شد معلم
جہاں را روشنی زاں شمع دیں بود | بعلم ظاہر و باطن مسلم
چو رحلت کرد در ذی قعدہ تابع | بوصل دوست خود گشتہ مکرم

بتاریخش خرد داد بگوشم
ندا از کامل و فیاض عالم

۱۱۳۰ھ

---

[۴] مآثر الکرام - ج ۱ - ص ۱۷ - ۳۱۶

[۵] تذکرہ ملا جیون مخطوطہ عبد القادر بن مُلّا جیون بحوالہ الفرقان ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ

[۶] ایضاً

مزار مبارک پر "و یتم نعمتہ علیک" کی لوح نصب کیگئی ہے۔

مُلّا جیون کی پوری زندگی [۱۳] درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزری، سلسلہ قادریہ میں مرید بھی ہوئے اور مجاز بیعت بھی۔ نیز سلسلہ چشتیہ سے بھی ان کا تعلق رہا ہے۔ ان کے علم و فضل کی حقیقی آئینہ دار تو ان کی تالیفات ہیں لیکن اس بارے میں مولانا آزاد بلگرامی کی یہ رائے بھی کم وقعت نہیں رکھتی کہ:

"حاصل کلام الہٰی و در دانش عقلی و نقلی
بحر لا متناہی" [۸]

تصانیف:

مُلّا جیون کی شہرت ان کی فاضلانہ تالیف "نور الانوار" اور "تفسیر احمدی" کی بدولت ہے لیکن انکے علاوہ بھی ان سے چند تالیفات یادگار ہیں۔

(۱) آدابِ احمدی۔ مُلّا صاحب نے یہ رسالہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ترتیب دیا اور "اسرار و سلوک" کے بنیادی اصول رقم فرمائے۔

(۲) خطباتِ جمعہ و عیدین

(۳) رسالہ در علم تجوید

(۴) مناقب الاولیاء۔ اسلاف کے حالات میں فارسی زبان میں یہ کتاب لکھی۔

(۵) مُلّا صاحب کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی مولانا روم کی مثنوی معنوی سے بہت متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی غلبۂ سکر و مستی میں "مثنوی معنوی" کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جس میں چھ دفتر اور کم و بیش ۲۵ ہزار اشعار تھے۔ حافظ شیرازی کے رنگ میں پانچ ہزار اشعار لکھے۔ قصیدہ بردہ کے طرز پر گیارہ سو بیس اشعار کا قصیدہ جُدا ہے۔ اس کے علاوہ زیارتِ حرمین کے سفر میں جدہ تک اسکی شرح بھی لکھ ڈالی۔ [۹]

مدینہ منورہ کے قیام میں غلبۂ شوق و اشتیاق میں عربی میں کئی قصائد لکھے۔ جنکی داد اہلِ مدینہ طیبہ نے خوب خوب دی اسی اشتیاق کے زیر اثر مولانا جامی کی سوانح پر ایک رسالہ "سوانح بر مجازات سوانح جامی" تلمبند کیا۔

(۶) نور الانوار۔ درسِ نظامی میں شامل فقہ کی مشہور کتاب ہے۔ جو امام ابو البرکات عبد اللہ بن احمد حافظ الدین نسفیؒ (م ۷۱۰ھ) کی "المنار" کی شرح ہے۔ ابو البرکات احناف میں جلیل القدر عالم گذرے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے ان کی "المنار" کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے۔

"متن متین جامع مختصر نافع وہو فیما بین کتبہ المبسوط و مختصرات المطلوبۃ اکثرہا تداولاً داقربہا تناولاً لکنہ مع صغر جسمہ وجازۃ نظم بحر محیط بدر الحقائق" [۱۰]

"یعنی عبارت ٹھوس، قوی، مختصر اور نفع بخش ہے۔ ان (ابو البرکات) کی مختصر اور مطول تمام کتابوں میں سے یہی متداول ہے۔ اور آسان بھی ہے۔ ہے تو چھوٹا سا رسالہ اور مؤلف نے اختصار سے بھی کام لیا ہے۔ تاہم حقائق کے موتیوں کا ایک عظیم سمندر ہے"

یوں تو "منار" کی کئی شرحیں ہیں لیکن ان میں سے متداول "نور الانوار" ہی ہے۔ نور الانوار کی زبان سادہ، طرز بیان دلکش اور طریقہ استنباط انتہائی سہل ہے۔ مدینہ منورہ میں ربیع الاول ۱۱۰۵ھ میں اسے لکھنا شروع کیا اور ۷ جمادی الاول ۱۱۰۵ھ کو ختم کر دیا [۱۱] اس کتاب کی تالیف میں کسی امدادی کتاب سے کام نہ لیا [۱۲]

(۷) تفسیر احمدی: یہ تفسیر بھی حرمین شریفین کے دوران قیام میں لکھی گئی۔ ۱۰۶۴ھ میں شروع کر کے ۱۰۶۹ھ میں ختم کی گئی۔ کتاب کے آغاز میں ایک علمی مقدمہ ہے جس میں قرآن حکیم سے مستنبط مختلف مسائل کا ذکر ہے۔ ○

---

[۸] ماثر الکرام ج ۱ ص: ۲۱۶

[۹] سوانح خود نوشت مُلّا جیون بحوالہ الفرقان ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ

[۱۰] کشف الظنون ج ۲ ص ۵۱۹ [۱۱] نور الانوار، خاتمہ کتاب [۱۲] بزم تیموریہ ص: ۲۲۴

تراشے

محمد تقی عثمانی

یہ جہاں جیب ہے: کیا ...؟

علامہ ابن اثیر جزری نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایرانی آتش پرستوں سے جہاد کرنے کیلئے قادسیہ پہنچے تو انھوں نے اپنے لشکر کے ایک افسر عاصم بن عمرؓ کو کسی کام سے میسان کے مقام پر بھیجا، یہ دشمن کے ملک میں ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ حضرت عاصم یہاں پہنچے تو رسد کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اور ساتھیوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ انھوں نے آس پاس تلاش شروع کی کہ شاید کوئی گائے بکری مل جائے مگر کافی جستجو کے باوجود کوئی جانور ہاتھ نہ آیا۔ اچانک انھیں بانس کے ایک چھپر کے پاس ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ انھوں نے اس سے جاکر پوچھا کہ "کیا یہاں آس پاس کوئی گائے بکری مل جائے گی؟" اس شخص نے کہا: "مجھے معلوم نہیں"۔ حضرت عاصم ابھی واپس نہیں لوٹے تھے کہ چھپر کے اندر سے ایک آواز سنائی دی:

"یہ خدا کا دشمن جھوٹ بولتا ہے، ہم یہاں موجود ہیں"۔

حضرت عاصم چھپر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کئی گائے بیل کھڑے ہیں۔ مگر وہاں کوئی آدمی نہیں تھا، اور یہ آواز ایک بیل کی تھی۔ حضرت عاصمؓ وہاں سے گائے بیل لے کر آئے اور انھیں لشکر میں تقسیم کیا۔

یہ واقعہ کسی نے حجاج بن یوسف کو سنایا تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے جنگ قادسیہ کے شرکاء کے پاس پیغام بھیج کر اس کی تصدیق کرنی چاہی تو بہت سے حضرات نے گواہی دی کہ اس واقعے کے وقت ہم موجود تھے، حجاج نے ان سے پوچھا:

"اس زمانے میں اس واقعے کے بارے میں لوگوں کا تأثر کیا تھا؟"

انھوں نے کہا "اس واقعے کو اس بات کی دلیل سمجھا جاتا تھا کہ اللہ ہم سے راضی ہے اور وہ ہمیں دشمن پر فتح عطا فرمائیگا۔

"یہ بات اسی وقت ہوسکتی ہے جب لوگوں کی اکثریت متقی و پرہیزگار ہو" حجاج نے کہا۔

"دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے" انھوں نے کہا۔ "لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ دنیا سے اس قدر بے نیاز قوم ہم نے ان کے بعد نہیں دیکھی"۔ (کامل ابن اثیر۔ ص ۵۷، ج ۲ طبع قدیم)

تصفیۂ قلب:

علامہ ابن خلدون اور طبری وغیرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں قتل ہونے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت علیؓ نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"لا یموتن أحد من ھؤلاء، وقلبہ نقی إلا دخل الجنۃ۔"

"اُن لوگوں میں سے جو شخص بھی صفائی قلب کے ساتھ مرا ہو گا وہ جنت میں جائے گا۔"

(مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۵ فصل ۳۲، بیروت ۱۹۵۶ء)

رضاعت اور سرطان:

ماسکو (روس) سے نکلنے والے ماہوار ڈائجسٹ اسپنک (انگریزی ایڈیشن) نے اپنی اگست ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ڈاکٹر الیگزینڈر جالکن (سکریٹری جنرل سویٹ کینسر سوسائٹی) کا ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی عورتوں میں سینے کے سرطان کا مرض بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اور اس سے بے شمار اموات واقع ہو رہی ہیں۔ اس بڑھتی ہوئی بیماری کا اہم سبب انھوں نے یہ بتایا ہے کہ آجکل کی عورتوں میں بچے کو اپنے سینے سے دودھ پلانے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے قرآن نے ماؤں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ دو سال کی عمر تک بچوں کو دودھ پلائیں دودھ پلانے کا یہ رواج ابھی تک ان مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے جو (اپنی عام زندگی میں) عملاً مذہب کی تعلیمات کو چھوڑ چکے ہیں اسکے علاوہ بہت سے غیر مسلموں میں بھی یہ رواج پایا جاتا ہے۔

ماں کا دودھ خواہ کتنی تھوڑی مقدار میں ہو، کبھی بچے کے لئے بہت مفید سمجھا جاتا تھا لیکن آجکل کی عورتوں نے، خاص طور سے امریکہ میں، اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور اب یہ فیشن عالمگیر ہوتا جا رہا ہے۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ امریکی عورتوں میں سینے کے سرطان کا مرض تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے

۱۹۵۲ء میں امریکہ میں سرطان کی تحقیق کے لئے جو تیسری قومی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں سینے کے سرطان کا یہی سبب بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بے شمار تحقیقات سے اس بیان کی تصدیق ہو گئی۔"

(ص ۸۳۔ شمارہ اگست ۱۹۶۸ء)

فلسطین کے مسئلے میں عربوں کا موقف

فلسطین کے مسئلہ میں سالہا سال سے ہر مسلمان دلچسپی لے رہا ہے، لیکن عام لوگ اس کے سیاسی اور تاریخی پس منظر سے پوری طرح واقف نہیں، تحریکِ پاکستان کے دور کے مشہور صحافی جناب حسن ریاض صاحب نے اس مضمون میں فلسطین کے مسئلے کو اس طرح پیش کیا ہے جس طرح عرب ممالک اسے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں — !

جناب حسن ریاض صاحب
جامعہ کراچی۔

فلسطین کا مسئلہ مسلمانانِ عالم کی نظر میں اس اعتبار سے خالص دینی ہے کہ فلسطین میں بیت المقدس ہے جو مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہے، اس میں وہ آثار ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کی بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ اس میں جابجا انبیاء علیہم السلام کے مزارات ہیں اور اسلام کے قرنِ اوّل سے ۱۹۴۷ء تک وہ اس مسلم اکثریت کا وطن رہا ہے جو نسلاً عرب ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ بھی ایک دینی مسئلہ ہے کہ فلسطین مسلمانوں کا قدیم وطن ہے اور یہودیوں نے ان کو بزور دستی وہاں سے نکال دیا ہے، یہ غیر مسلموں کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اس کو صرف سیاسی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کے دوسرے مذہبی دعوؤں کے جواب میں، یہ کہتے ہیں کہ فلسطین اسی طرح یہودیوں کے لئے بھی مقدس ہے، اور عیسائیوں کے لئے بھی مقدس ہے اور فلسطین میں یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی زیارت گاہیں ہیں، اور جن انبیاء علیہم السلام کے مزارات فلسطین میں ہیں یہودی اور عیسائی بھی ان کو مانتے ہیں۔

عرب اس جھگڑے میں نہیں پڑتے کہ وہ دول مغرب کو یہ سمجھائیں کہ فلسطین ہر طرح مسلمانوں کا دینی مسئلہ ہے یا کسی طرح دینی مسئلہ ہے۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ فلسطین عربوں کا وطن ہے اور ہمیشہ سے ہے اور وہ کبھی یہودیوں کا وطن نہیں رہا۔ لہٰذا فلسطین کے عربوں کو فلسطین میں حق خود ارادیت ملنا چاہئیے خواہ وہ عیسائی ہوں، دہری ہوں یا مسلمان ہوں۔ ابتدا میں وہ فلسطین کے صرف ان اصل باشندوں کے لئے حق خود ارادیت مانگتے تھے جو جنگِ عظیم اوّل تک اس سرزمین میں آباد تھے اب انھوں نے اصل باشندوں کی قید بھی ہٹادی ہے اور ان سب کو منظور کرتے ہیں جو اس وقت وہاں ہیں۔

عربوں کا یہ دعویٰ سابق لیگ اقوام، اٹلانٹک چارٹر اور موجودہ اقوام متحدہ کے منشوروں کے مطابق ہے اور اسی زبان میں ہے جو عہد حاضر کے ماہرینِ سیاست بولتے ہیں وہ اس سے صاف انکار کرتے ہیں کہ فلسطین کبھی یہودیوں کا وطن تھا اور بے شک تاریخ

اس کی شاہد ہے کہ فلسطین کبھی یہودیوں کا وطن نہیں تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل سے ہجرت کر کے فلسطین تشریف لائے، حضرت اسحٰق علیہ السلام وہیں پیدا ہوئے اور رہے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام فلسطین میں پیدا ہوئے مگر آخر عمر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی درخواست پر مع اپنے گیارہ بیٹوں کے مصر چلے گئے اور تمام بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے کچھ عرصے بعد تک مصر میں مقیم رہے۔ ان صدہا برس کے دوران فلسطین ویران نہیں تھا اس میں وہی لوگ آباد رہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد سے قبل وہاں تھے۔ تاریخ میں اور توریت میں ان کا نام کنعان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل فلسطین واپس آئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد نکالے گئے۔ پھر آئے اور پھر نکالے گئے۔ اس طرح تین دفعہ ہوا گویا تین مختلف وقفوں کے اندر یہودیوں نے فلسطین میں صرف پناہ لی ہے۔ وہ انکا وطن کبھی نہیں ہوا۔ فلسطین کے عرب باشندوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ کنعانیوں کی نسل سے ہیں جو وہاں ہمیشہ آباد رہے لہٰذا فلسطین صرف انہی کا وطن ہے اور کسی کا نہیں۔

دولِ یورپ کا یہ ہمیشہ سے معمول رہا ہے کہ وہ کبھی مذہب کے بہانے سے سیاسی مقاصد حاصل کرتی ہیں اور کبھی سیاست کے بہانے سے مذہبی مقاصد۔ یورپ کی تاریخ یہودیوں پر عیسائیوں کے مظالم سے لبریز ہے۔ مشکل سے یورپ کا کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں یہودیوں کا قتل عام نہ ہوا ہو، اور جہاں سے یہودی نکالے نہ گئے ہوں۔ ان نکالے ہوئے یہودیوں کو ہمیشہ مسلمان ممالک میں پناہ ملی اور مسلمانوں کے اس احسان کے جواب میں یہودیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ غداری کی۔ ان کے مذہبی پیشوا یورپ کے ممالک میں اپنے جھنڈے لئے گھومتے رہے اور فلسطین میں دوبارہ آباد ہونے کی تمنا کے اظہار میں نعرے لگاتے رہے۔

یورپ کی مسیحی اقوام، ان کے مذہبی پیشوا اور انکی حکومتیں عرصۂ دراز تک فلسطین پر قبضہ کے لئے بے قرار رہیں۔ اس کا محرک بظاہر ان کا مذہبی جنون تھا، لیکن فی الحقیقت ایشیائے کوچک بحیرۂ روم اور شمالی افریقہ سے مسلمانوں کو بے دخل کرنیکا منصوبہ۔ بحیرۂ روم کو وہ مغربی تہذیب کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اور اس کے اطراف و جوانب کو اس کے تحفظ کے لئے اشد ضروری۔ اس دنیوی مقصد کے لئے انھوں نے صدیوں مسلمانوں سے ــــ مذہبی جنگ کی انہی جنگوں کے طویل سلسلے کا نام جنگہائے صلیبی ہے۔ دُنیائے مسیحیت اپنی متفقہ کوشش کے باوجود، اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ بالآخر پہلی عالمگیر جنگ میں انگریزوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا اور لائڈ جارج نے جو اس وقت انگلستان کا وزیر اعظم تھا، جنرل ایلنبی کے کامیاب حملے کا سلسلہ جنگہائے صلیبی سے جوڑا اور اس فتح کو مسیحیت کی فتح قرار دیکر خوشی منائی۔

اس جنگ اور ان صلح کانفرنسوں کے دوران میں، جو مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے لئے ہوئیں تحریک صیہونیت کے لیڈر بڑے سرگرم کار تھے۔ دوسری طرف عیسائی، ایک قوم اور ایک حکومت نہیں تھے بلکہ بہت سی اقوام اور بہت سی حکومتوں پر مشتمل تھے۔ یہ مشکل تھا کہ سب اس پر متفق ہو جاتے کہ فلسطین اور بیت المقدس پر صرف برطانیہ دواماً قابض رہے۔ لیگ اقوام نے مغربی اقوام کے درمیان رقابت رفع کرنے کے لئے پہلے ہی یہ اصول معین کر دیا تھا کہ ہر قوم کو اسکے وطن میں حق خود ارادیت حاصل ہوگا اور کوئی قوم دوسروں کے وطن پر تسلط حاصل کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ فلسطین انگریزوں کا نہیں، بلکہ عربوں کا وطن تھا، جن کی بہت بڑی اکثریت مسلمان تھی۔ مسیحی دولتوں کو یہ گوارا نہیں تھا کہ فلسطین پھر مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ کیونکہ اس سے جنگہائے صلیبی کا مقصد حاصل ہونے کے بعد فوت ہو جاتا۔ اس لئے وہ سب اس پر متفق ہوگئیں کہ یہودیوں کی یہ درخواست منظور کرلیں کہ فلسطین

یہودیوں کا قومی وطن قرار دیا جائے۔ یورپ کی فاتح مسیحی اقوام کے اس اتفاق رائے کا اظہار، انگلستان کے وزیر خارجہ مسٹر بالفور نے ایک اعلان کے ذریعہ سے کیا جس میں عربوں کے حق وطنیت سے بغیر انکار کئے، فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن قرار دینے کی سفارش کی تھی۔ لیگ اقوام نے جو دنیا کی باہمی تقسیم کے لئے مسیحی دولتوں کی ایک مشترکہ انجمن تھی، یہ ظالمانہ اور مجموعۂ اضداد تجویز بلا پس و پیش منظور کرلی

یورپ کی فاتح دولتوں کے مقاصد پورے کرنے کے لئے لیگ اقوام نے انتداب کا ایک پرفساد نظام قائم کیا تھا جس کے ماتحت وہ فاتح دولتوں کو ایشیا اور افریقہ کے مفتوحہ علاقوں میں اپنی طرف سے منتظم مقرر کرتی تھی اس نے فلسطین اور عراق کا انتداب برطانیہ کو دیا تاکہ وہ اس منصوبے پر عملدرآمد کردے جس کے لئے اعلان بالفور کیا گیا تھا۔

برطانیہ نے اس کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں کہ یہودی آئیں اور فلسطین میں آباد ہوں۔ اور عربوں کی املاک حاصل حاصل کریں۔ چند سال کے اندر وہ یہودی، جو جنگ عظیم سے قبل فلسطین بیس ہزار بارہ سو سے زیادہ نہ تھے اتنے ہوگئے کہ وہ اپنی خفیہ عسکری تنظیمات قائم کرنے لگے ساری دنیا کے یہودی ان کے لئے روپیہ بھیج رہے تھے اور وہ اس روپے سے اسلحہ خرید رہے تھے اور اس سیاسی نظام کی بنیادیں رکھ رہے تھے جس نے بالآخر اسرائیل کی صورت اختیار کی یہودیوں کے مقابلے میں عربوں نے اپنے وطنی حقوق کی حفاظت کے لئے جو تدابیر کیں برطانیہ نے بڑی شدت سے ان کی مخالفت کی۔ اور عربوں پر سخت مظالم کئے جب نوبت آگئی کہ یا برطانیہ عربوں کا مطالبہ خودارادیت پورا کرے یا کھل کر صیہونیت کے حلیف کی حیثیت سے عربوں کے مقابلے میں جنگ کرے تو اس جھگڑے سے بچنے کے لئے وہ انتداب سے دست بردار ہو گیا۔ اور فلسطین کا مسئلہ اس نے اقوام متحدہ کے حوالے کردیا۔ جو لیگ اقوام کی جانشین ہے۔

لیگ اقوام نے دنیائے اسلام کے سخت احتجاج کے باوجود اور حق کے خلاف، انصاف کے خلاف، قانون و اخلاق اور ان تمام وعدوں اور اعلانات کے خلاف جو پہلی جنگ عظیم کے اتحادیوں، لیگ اقوام اور برطانیہ نے مسلمانوں سے اور عربوں سے کئے تھے، عربوں اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کی تقسیم کا اعلان کردیا اور یہودیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے حصے کے علاقے میں آزاد اور خود مختار دولت قائم کریں۔

یہودیوں نے اس فیصلے کی، جو پورے کا پورا، نہایت بددیانتی کے ساتھ، انہی کے نفع کے لئے تھا، اس طرح نہایت بے باکی سے، خلاف ورزی کی کہ اقوام متحدہ نے تقسیم میں جو علاقہ عربوں کے لئے مختص کیا تھا، اس پر بھی قبضہ کرنا شروع کردیا اور اس سے پہلے ہی کہ نام نہاد ریاست اسرائیل قائم ہوئی اور اس سے بھی پہلے کہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانوی انتداب ختم ہوا انھوں نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو یافہ پر اور ۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عکہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ دونوں شہر اقوام متحدہ کے منصوبے کے مطابق اس فلسطین میں تھے جو عربوں کے لئے تھا اس طرح یہودیوں نے عربوں کے خلاف جارحانہ حملہ کیا لہٰذا عرب افواج اس غرض سے فلسطین میں داخل ہوئیں کہ یہودیوں کو عرب علاقے میں داخل ہونے سے روکیں۔ اور عربوں اور یہودیوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی اور پھر فائر بندی عمل میں آئی۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ فلسطین میں یہودی اپنی ریاست قائم کرسکتے ہیں اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اسرائیل کے نام سے اپنی خود مختار ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا اور مسلمان عربوں کو اپنی ریاست کی حدود سے باہر نکال دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان فلسطینی عربوں نے، جو اپنے وطن اور گھروں سے نکالے گئے تھے اور شام اور اردن کے میدانوں میں زیر سما اور بلا وسائل معاش پڑے

ہوئے تھے فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ سے آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کردی۔ عربوں کی اسی بے ترتیب جدوجہد نے اب ماہرانہ جنگِ چپاول (GUERILLA WARFARE) کی صورت اختیار کرلی ہے۔ الفتح، آصفہ اور دوسری ٹولیاں الجزائر کے ان استادوں سے تربیت حاصل کر رہی ہیں جنھوں نے فرانس کے مقابلے میں ٹولیوں کی جنگ کی اور فتحیاب ہوئے۔ اور شمالی ویت نام سے ان کو اسلحے مل رہے ہیں اب تک یہ عرب ٹولیاں اسرائیل پر چھاپے مارتی تھیں جن کا اثر محض یہ تھا کہ اسرائیل ان سے پریشان تھا لیکن حال میں الفتح نے یہ اعلان کیا ہے کہ جنگ کی یہ نوعیت ختم ہوئی اور عنقریب عرب جمعیتیں اسرائیل کے مقابلے میں کھل کر صف آرا ہونگی۔

عرب ممالک کی افواج صرف ۱۹۴۹ء میں اس غرض سے داخل ہوئی تھیں کہ یہودیوں کو فلسطین کے اس علاقے پر قبضہ کرنے سے روکیں جو اقوام متحدہ نے فلسطینی عربوں کے لئے معین کیا تھا۔ اس پر جنگ ہوئی اور عربوں نے شکست کھائی اور اقوام متحدہ نے فیر بندی کرائی۔ اس کے بعد پھر کبھی عرب ممالک کی افواج نے فلسطین پر حملہ نہیں کیا۔ ۱۹۵۶ء میں دوسری جنگ ہوئی اس میں اسرائیل نے مصر کے علاقہ سینا پر حملہ کیا اور پھر سوئز پر جنگ ہوئی۔ برطانیہ اور فرانس نے بھی مصر پر حملہ کیا۔ اقوام متحدہ نے پھر جنگ بند کرادی اور مصر و اسرائیل کی سرحد پر اپنی نگران، فوجی جمعیت متعین کردی۔ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں مصر اور اردن پر حملہ کیا۔ یہ جنگ صرف چھ روز جاری رہی جس میں عربوں کو سخت ہزیمت ہوئی۔ اسرائیل نے مغربی اردن اور بیت المقدس اور علاقہ سینا پر قبضہ کرلیا۔ اقوام متحدہ نے جنگ بند کرائی اور یہ مطالبہ کیا کہ اسرائیل کی افواج اپنی ان سرحدوں پر واپس جائیں جہاں وہ آغاز جنگ سے قبل تھیں۔ اسرائیل اقوام متحدہ کی اس قرارداد کی تعمیل سے انکار کر رہا ہے اور اس کا یہ اصرار ہے کہ جب تک عرب حکومتیں براہ راست ـــ اس سے گفت و شنید کر کے، معاہدہ صلح نہیں کرینگی اسرائیل مفتوحہ علاقوں پر قابض رہے گا۔

عرب حکومتیں اسرائیل سے براہ راست گفت و شنید کرنے سے قطعی انکار کرتی ہیں۔ عرب حکومتوں نے اسرائیل کو کبھی جائز ریاست قبول نہیں کیا دُنیا کی مسلمان دولتوں نے بھی اسرائیل کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اسرائیل فلسطینی عربوں کی سرزمین پر اور ان کے وطن پر ایک ڈاکہ، ایک جابرانہ تسلط اور اسلام کے خلاف مغربی اقوام کی سازش کا مظہر ہے۔ اقوام متحدہ اپنے منشور اور اپنے ضوابط کی رُو سے اس کی ہرگز مجاز نہ تھی کہ عربوں کے وطن میں یہودیوں کو اپنی آزاد اور خود مختار دولت قائم کرنے کی اجازت دے۔ لہٰذا اقوام متحدہ کا یہ ایک بے ضابطہ فعل ہے کہ اس نے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کیا اور پھر یہودیوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ پورے فلسطین پر قبضہ کرلیں۔ اب اگر عرب دولتیں اسرائیل کے ساتھ صلح کی گفت و شنید کرنا منظور کرلیں تو اس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ انھوں نے اسرائیل کو جائز ریاست تسلیم کرلیا۔ اور یہ تسلیم کرلیا کہ اقوام متحدہ کو یہ حق تھا کہ عربوں کے وطن کو تقسیم کر کے، اس میں یہودیوں کو ریاست قائم کرنے کی اجازت دے دے۔ عرب دولتیں اس سے صاف انکار کرتی ہیں اور اس لئے انکار کرتی ہیں کہ اصولِ حق خودارادیت کی بنا پر صرف فلسطین کے اصل باشندوں ہی کو یہ اختیار ہے کہ وہ فلسطین کے حال و مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کریں۔ کوئی دوسری عرب دولت یا تمام عرب دولتیں مل کر بھی اس کی مجاز نہیں لہٰذا عرب دولتیں اسرائیل سے ہرگز گفت و شنید نہیں کریں گی۔ لیکن چونکہ فلسطین کے عرب، عرب قوم کا جزو ہیں اور فلسطین عرب سرزمین کا ایک حصہ ہے اور اسرائیل کا وجود تمام عرب ممالک کے لئے خطرناک ہے اس لئے تمام عرب دولتیں اور اقوام اس میں ہمیشہ فلسطینی عربوں کی حمایت اور مدد کرینگی کہ وہ ـــ اپنے وطن میں حقِ خودارادیت حاصل کریں۔

۱۹۴۹ء کے بعد سے مسلسل صورت حال یہ ہے کہ وہ فلسطینی عرب جن کو اسرائیل نے ان کے گھروں سے نکال دیا ہے، شام سے، اردن سے اور وادیٔ سینا سے اسرائیل پر حملے کرتے ہیں اور اسرائیل اس کے جواب میں شام، اردن اور مصر پر حملے کرتا ہے۔ گویا فلسطین پر حملہ کرنے والے ہیں فلسطین کے وہ عرب، جو شام، اردن یا سینا میں پناہ گزین ہیں، اور اس غرض سے کہ اپنے وطن کو آزاد کرائیں اور اپنے گھر اور جائیدادیں غاصب یہودیوں سے واپس لیں، مگر اسرائیل کے حملوں کی ضرب پڑتی ہے شام، اردن اور مصر کی حکومتوں پر جن کو مجبوراً مدافعت کرنی پڑتی ہے۔

اس طرح عرب دولتوں پر اسرائیل نے جتنے حملے کئے ہیں وہ سب جارحانہ تھے اور اقوام متحدہ کو ہر موقع پر اسکی تصدیق کرنی پڑی ہے اور فلسطینی عربوں نے اسرائیل پر جتنے حملے کئے ہیں وہ سب اپنے وطن میں استقرار حق خود ارادیت کے لئے ہیں، لہذا جائز ہیں اور ایسے ہیں کہ ساری دنیا ان کی تائید کرے۔

یہ اور بات ہے کہ تینوں جنگوں میں اسرائیل کامیاب رہا ہے اور اس نے اردن، شام اور مصر کے علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے لیکن جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ خواہ اسرائیل یہ تمام علاقے واپس کر دے جو ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس نے فتح کئے ہیں یا نہ کرے فلسطین کے عرب اپنے وطن کو آزاد کرانے اور اپنے آزاد وطن واپس جانے اور وہاں ایسا سیاسی نظام قائم کرنے کے لئے، جنگ وجہاد جاری رکھیں گے جو ان کی مرضی اور مفاد کے مطابق ہو۔ اور عرب دولتیں اور تمام دُنیا کے مسلمان ان کی حمایت کریں گے۔

ہوسکتا ہے کہ مغربی دول کے دباؤ سے، حالات کے دباؤ سے یا باہمی اختلاف کی وجہ سے عرب دولتیں کسی سیاسی فیصلہ پر متفق ہو جائیں لیکن فلسطین کے باشندے نہ اقوام متحدہ کے رکن ہیں اور نہ مغربی دول کے ساتھ انکے سفارتی تعلقات اور معاہدات ہیں، لہذا وہ اس کے بالکل پابند نہیں کہ عرب دولتیں اگر کسی ایسی بات پر رضامند ہو جائیں جو فلسطینی عربوں کی خود ارادیت کے خلاف ہو تو وہ بھی اس کو ضرور قبول کر لیں یہ جنگ فی الحقیقت یہودیوں اور فلسطین کے عربوں کے درمیان ہے۔ اس کا فیصلہ جب کبھی ہوگا انہی کے درمیان ہوگا اور وہ فیصلہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا کہ اسرائیل کا وجود بحیثیت ایک دولت کے مٹے اور فلسطین میں کوئی ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جس میں باشندگان فلسطین کی مرضی کا غلبہ ہو۔ یہ سب مہاجر فلسطین میں واپس جائیں جن کو اسرائیل نے نکال دیا ہے۔ اپنے گھروں میں آباد ہوں اور اپنی جائیدادوں پر قابض ہوں۔ اسرائیل کا وجود فنا ہوتے ہی فلسطین میں وہ صورت حال از خود واپس آجائے گی جو مسلمانوں کے انتظام میں ایک ہزار سال سے زیادہ قائم رہی تھی کہ عیسائی اور یہودی آزادی سے اپنے مقدس مقامات کی زیارت کریں اور بیت المقدس کا انتظام بہرحال مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے۔

فلسطین کے عرب اور تمام عرب فلسطین کے مسئلے کو عربوں کا مسئلہ کیوں کہتے ہیں، اختصار کے ساتھ اس کا سبب یہ ہے کہ فلسطین اور تمام مشرق وسطیٰ کے غیر مسلم عرب باشندے مسلم عربوں کے ساتھ اس پر بالکل متفق ہیں کہ اعلان بالفور حق کے خلاف ہے، فلسطین میں اسرائیل کا وجود ناجائز ہے، فلسطین میں عربوں کو حق خود ارادیت ملنا چاہیئے۔ اور وہاں ان کی ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جس میں ہر بالغ شخص کا ایک ووٹ ہو۔

عربوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ مسلمانانِ عالم فلسطین کو اپنا دینی مسئلہ کہیں۔ ان کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ فلسطین کو صیہونیت کے غاصبانہ قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے مسلمانانِ عالم جہاد کریں مگر صیہونیت کے ناجائز تسلط اور اقوام متحدہ کے غیر آئینی فیصلے کے جواب میں عربوں کا دعویٰ یہی ہے کہ فلسطین صرف عربوں کا وطن ہے اور انہیں صرف انہی کو حق خود ارادیت ملنا چاہیئے۔

غلافِ کعبہ سے!

(حضرتؔ زکی کیفیؔ)

غلافِ کعبہ تیری عظمتوں کا کیا کہنا
عروسِ حسنِ ازل کا لباسِ نور ہے تو
گناہگار تیرا کیوں نہ چوم لیں دامن
امینِ رازِ وفا، جلوہ زارِ طور ہے تو

کمالِ فرض کا پیکر ہے تیری ہستی میں
کسی کی ذات میں خود کو مٹا دیا تو نے
ہر آن سینہ سپر ہے حرم کی خدمت میں
دلوں میں نقشِ محبت جما دیا تو نے

یہ تیرا جذبۂ خدمت ہے رشک کے قابل
غبارِ دامنِ کعبہ تک آ نہیں سکتا
حوادثات کے طوفاں ہزار ٹکرائیں
تو اپنے فرض کو لیکن بھلا نہیں سکتا

تجھے نصیب ہے قربت حرم کے سینے سے
حریمِ حسنِ حقیقت کا راز دار ہے تو
ہے تیرا مقصدِ ہستی حرم کی زیبائش
نگارِ حسنِ تجلی کا پردہ دار ہے تو

درِ حرم کے محافظ ادائے فرض کے بعد
جہاں بھی اہلِ وفا تجھ کو دیکھ پائیں گے
سکونِ قلب کی خاطر لگا کے سینے سے
ہر ایک تار ترا تارِ جاں بنائیں گے

غلافِ کعبہ قسم مجھ کو ربّ کی!
تجھے جو دیکھا تو آنکھوں میں اشک بھر آئے
تصورات کی دنیا میں ایک ہلچل ہے
جو دل میں داغ تھے پوشیدہ وہ نکھر آئے

نہ پوچھ مجھ سے کہ میں گم ہوں کن خیالوں میں
گذر رہی ہے جو دل پر بتا نہیں سکتا
ٹپک رہے ہیں کیوں اشک آج آنکھوں سے
تری نظر سے نظر کیوں ملا نہیں سکتا

یہ سوچتا ہوں بھلا مجھ کو تجھ سے کیا نسبت
زمینِ عجز ہوں میں رشکِ آسماں تو ہے
میں ایک راہِ محبت کا راہ گُم کردہ
حریمِ منزلِ محبوب کا نشاں تو ہے

شرف مجھے بھی تھا حاصل حرم کی خدمت کا
مگر یہ فرضِ محبت بھلا دیا میں نے
مرا ضمیر بھی بیدار تھا کبھی لیکن
ہوس کی گود میں اسکو سُلا دیا میں نے

مجھے بھی ناز تھا کعبہ کی پاسبانی پر
حرم کے حسنِ نہاں کا تھا رازداں میں بھی
سرِ نماز میں تھی شان کج کلاہی کی
غمِ حبیب سے رہتا تھا شاداں میں بھی

غرورِ علم جہالت کی راہ پر لایا
حرم کی راہ سے بیگانہ کر دیا مجھ کو
میں ایک رازِ حقیقت تھا بزمِ دنیا میں
مگر خرد نے اک افسانہ کر دیا مجھ کو

درِ حرم سے جدا ہو کے تیرہ بختی سے
جہاں میں خود کو تماشہ بنا دیا میں نے
وہ دل جو مرکزِ انوارِ حق تھا اس دل کو
بتانِ حرص و ہوس سے سجا دیا میں نے

تھا میرا فرض حرم کا پیام پہنچانا
چمن میں دشت میں صحرا میں خشک میں تر میں
حرم سے خیر کی دولت لئے ہوئے نکلا
الجھ کے رہ گیا لیکن میں دامنِ شر میں

گناہ گارِ محبت ہوں اے غلافِ حرم
کھڑا ہوں شرم و ندامت سے سر جھکائے ہوئے
مجھے سنبھال خدا کے لئے سنبھال مجھے
شکستہ دل ہوں قدم بھی ہیں لڑکھڑائے ہوئے

اداشناسِ وفا اے حرم پیراہن
مرے لئے بھی سرِ ملتزم دعا کرنا
عطا ہو پھر مجھے احساسِ فرض کی دولت
نصیب کیوں ہو حرم سے مجھے وفا کرنا

دیارِ حسن و تجلی کے راہ رو تجھ پر!
یہ چند اشکِ ندامت نثار کرتا ہوں
خزاں نصیب ہوں میں اے نسیمِ حرم
دعائے آمدِ فصلِ بہار کرتا ہوں

خواتینِ اسلامؒ

سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری

حدیث نمبر ۳۳

وعن عقبة بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایاکم والدخول علی النساء فقال رجل یا رسول اللہ ارأیت الحمو قال الحمو الموت (رواہ البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نامحرم عورتوں کے پاس مت جایا کرو۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ عورت کی سسرال کے مردوں کے متعلق کیا حکم ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سسرال رشتہ دار تو موت ہیں (مشکوٰۃ شریف، ص: ۲۶۸)

تشریح: اس حدیث میں جو سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی سسرال کے مردوں کو موت سے تشبیہ دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اپنے جیٹھ دیور اور نندوئی وغیرہ سے اور اسی طرح سسرال کے دوسرے مردوں سے گہرا پردہ کرے۔ یوں تو ہر نامحرم سے پردہ کرنا لازم ہے، لیکن جیٹھ دیور اور ان کے رشتہ داروں کے سامنے آنے سے اسی طرح بچنا ضروری ہے جیسے موت سے بچنے کو ضروری خیال کرتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنا سمجھ کر اندر بلا لیا جاتا ہے۔ اور بلا تکلف جیٹھ دیور اور شوہر کے عزیز و قریب اندر چلے جاتے ہیں اور بہت زیادہ خلا ملا کر لیتی ہیں اور ہنسی دل لگی تک کی نوبتیں آجاتی ہیں شوہر یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو اپنے لوگ ہیں ان سے کیا روک ٹوک کی جائے۔ لیکن بعد میں کبھی افسوسناک حالات وجود میں آجاتے ہیں۔ اور جب دونوں طرف سے یگانگت جذبات ہوں کثرت سے آنا جانا ہو اور شوہر گھر سے غائب ہو تو پھر ان ہونے واقعات تک رونما ہو جاتے ہیں۔ ایک پڑوسی کسی عورت کو اتنی جلدی اغوا نہیں کر سکتا ہے جتنی جلدی اور با آسانی دیور یا جیٹھ اپنی بھابی کو اغوا کرنے پر آمادہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ انھیں حالات کے پیش نظر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سسرال کے مردوں سے بچنے اور پردہ کرنے کی سخت تاکید فرما دی ہے۔ اور ان لوگوں کو موت بتا کر یہ سمجھایا ہے کہ ان سے ایسا پرہیز کرو جیسا موت سے بچنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی حکم ہے کہ اپنی بھاوج اور سالے کی بیوی سے خلا ملا نہ رکھیں۔ اور نظر نہ ڈالیں۔ قال فی اللمعات والمراد تحذیر المرأۃ

منہم کما یحذر من الموت فان الخوف من الاقارب
اکثر والفتنۃ منہم اوقع لتمکنہم من الوصول الخلوۃ
من غیر نکیر۔ بعض عورتیں اپنے دیور کو چھوٹی عمر میں پرورش
کرتی ہیں اور جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس سے پردہ کرنے کو
برا سمجھتی ہیں۔ اور اگر مسئلہ بتایا جاتا ہے کہ یہ نامحرم ہے تو کہتی ہیں
کہ اس کو ہم نے چھوٹا سا پالا ہے، رات دن ساتھ رہا ہے اس
سے کیا پردہ یہ بڑے گناہ کی بات ہے کہ آدمی گناہ بھی کرے
اور شریعت کے مقابلے میں کٹ حجتی پر اتر آئے۔ اللہ کے
رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو دیور کو موت بتائیں اور جہالت کی
ماری عورتیں اس کے مقابلے میں اس کے سامنے آنے کو ضروری
سمجھیں یہ کیا مسلمانی ہے۔

تنبیہ: پردہ حق شرع ہے۔ شوہر کا حق نہیں ہے۔
بہت سی عورتیں سمجھتی ہیں کہ شوہر جس سے پردہ کرائے اس سے
کیا جائے اور شوہر جس کے سامنے آنے کو کہے اس کے سامنے
آجائیں۔ یہ سراسر غلط ہے شوہر ہو یا کوئی دوسرا شخص اسکے
کہنے سے گناہ کرنے کی اجازت نہیں ہو جاتی خوب سمجھ لو۔

حدیث نمبر ۳۴:

عن ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہا کانت
عند رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ومیمونۃ
اذ اقبل ابن ام مکتوم فدخل علیہ فقال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم احتجبا منہ فقلت یا رسول اللہ
الیس ھو اعمیٰ لا یبصرنا فقال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم افعمیاوان انتما الستما تبصرانہ
(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

ترجمہ: ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں
کہ میں اور میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے پاس تھیں کہ اچانک عبداللہ ابن ام مکتوم (نابینا
رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سامنے سے آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے پاس آنے لگے۔ (چونکہ عبداللہ نابینا تھے اس لئے
ہم دونوں نے ان سے پردہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا اور اسی طرح
اپنی جگہ بیٹھی رہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا کہ ان سے پردہ کرو۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ
کیا وہ نابینا نہیں ہیں؟ ہم کو تو وہ نہیں دیکھ رہے ہیں! اسکے
جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں
(بھی) نابینا ہو؟ کیا تم ان کو نہیں دیکھ رہی ہو۔ (احمد، ترمذی
ابوداؤد) (مشکوٰۃ شریف ص: ۲۶۹)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو بھی
جہاں تک ممکن ہو سکے مردوں پر نظر ڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیئے
حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نابینا تھے۔ پاکباز صحابی تھے حضور
اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں بیویاں نہایت پاک دامن تھیں
اس کے باوجود بھی آپ نے دونوں بیویوں کو حکم فرمایا کہ حضرت
عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پردہ کریں یعنی ان پر نظر نہ ڈالیں۔
پس جہاں بدنظری کا ذرا بھی احتمال نہ تھا وہاں اسی قدر سختی
فرمائی گئی۔ تو آجکل کی عورتوں کے لئے اس امر کی کیوں کر اجازت
ہو سکتی ہے کہ مردوں کو جھانکا تاکا کریں۔ یوں اگر کوئی عورت
ضرورتاً سفر میں نکلی اور راستہ چلتے ہوئے بلا اختیار راہ گیروں
پر نظر پڑ گئی تو وہ دوسری بات ہے۔ لیکن قصداً وارادۃً مردوں پر نظر
ڈالنا سخت منع ہے۔ سورۂ نور کے چوتھے رکوع میں جہاں مردوں
کو نظریں پست کرنے کا حکم فرمایا ہے وہاں عورتوں کو بھی اسی
چیز کا پابند بنایا ہے۔ (وقل للمومنین یقضفن من ابصارھن)

اسی سے بیاہ شادی کی اس قبیح رسم کی ممانعت بھی معلوم
ہوئی کہ جب دولہا دولہن کو لے کر رخصت ہونے لگتا ہے
تو اس کو سلامی کے لئے گھر میں اندر بلایا جاتا ہے اور جو عورتیں
کنبہ کی یا پاس پڑوس کی یا مہمانی میں دور دراز سے آئی ہوئی موجود ہوتی ہیں
سب دولہا کو دیکھتی ہیں۔ اور سالیاں اس سے مذاق کرتی ہیں
کوئی اس کا جوتا چھپاتی ہے اور کوئی اس کے منہ پر چونا لگاتی ہے
اس طرح عورتوں کے بھرے مجمع میں ایک غیر محرم مرد کا آجانا
جو جوانی سے بھرپور ہے اور بہترین لباس و پوشاک پہنے ہوئے

ہے کسی طرح درست نہیں خصوصاً جب کہ عورتوں کا مقصد بھی دولہا کو دیکھنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلامی کی مجلس برخواست ہونے کے بعد عورتیں بڑی بے باکی سے دولہے کی شکل وصورت پر تبصرہ کرتی ہیں۔

حدیث نمبر: ٣٥

وعن الحسن مرسلاً قال بلغني ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لعن الله الناظر والمنظور الیه

(رواہ البیهقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو دیکھنے والے پر اور جس کی طرف دیکھا جائے اس پر بھی۔ (بیہقی فی شعب الایمان، مشکوۃ شریف)

تشریح: یہ حدیث بہت سے جزئیات پر حاوی ہے جنمیں بطور قاعدہ کلیہ کے ہر نظر حرام کو مستحق لعنت بتایا ہے اور نہ صرف دیکھنے والے پر لعنت بھیجی بلکہ اپنی خوشی اور اختیار سے جو کوئی مرد یا عورت کسی ایسی جگہ کھڑا ہو جہاں سے اسے کوئی غیر محرم دیکھ سکے یا کوئی بھی مرد عورت کسی مرد عورت کے سامنے وہ حصہ کھول دے یا کھلا رہنے دے جس کا دیکھنا اس کے لئے حلال نہ ہو جسکے سامنے کھلا رہے تو یہ دکھانے والا بھی مستحق لعنت ہے۔ مزید تشریح یہ ہے کہ کوئی عورت بغیر پردہ کے بازار میں یا میلہ میں یا پارک میں چلی گئی جس کی وجہ سے غیر مردوں نے اسے دیکھ لیا تو وہ مرد اور یہ عورت اُس لعنت کے مستحق ہوئے

اسی طرح کوئی عورت دروازہ سے یا کھڑکی سے یا برآمدہ سے باہر تاکتی جھانکتی ہے تو یہ عورت بدنظری کی وجہ سے مستحق لعنت ہے۔ اور غیر مردوں کو دیکھنے کا موقع دینے سے بھی لعنت کی مستحق ہوئی۔ اسی طرح سے شادی کے موقع پر سلامی کے لئے جب دولہا اندر گھر میں گیا اور نامحرم عورتوں کو دیکھنے کا موقع دیا تو یہ دولہا عورتوں کے درمیان بیٹھنے کی وجہ سے اور عورتیں اس کو دیکھنے کی وجہ سے لعنت کی مستحق ہوئیں۔ کسی عورت نے کسی عورت کو اگر ناف سے لے کر گھٹنوں کے ختم تک کا حصہ پورا یا کچھ دکھلا دیا تو دیکھنے والی اور دکھانے والی دونوں لعنت کی مستحق ہوئیں۔ اسی طرح اگر کسی مرد نے کسی مرد کے سامنے ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنوں کے ختم کا پورا حصہ کھول دیا تو دکھانے والا اور دیکھنے والا دونوں لعنت کے مستحق ہوئے۔ کسی عورت نے اپنے محرم یعنی باپ بھائی وغیرہ کے سامنے اپنا پیٹ یا پیٹھ یا ران یا گھٹنا کھول دیا تو دیکھنے والا اور دکھانے والی دونوں نے لعنت کا کام کرلیا۔ بہت سے مغربیت زدہ گھرانوں میں یہ آفت ہے کہ انگریز عورتوں کی دیکھا دیکھی صرف ایک فراک پہنے ہوئے گھروں میں رہتی ہیں اور پائجامہ یا ساڑھی کی جگہ ذرا سی لنگوٹی یا جانگیا پہنے رہتی ھیں جس کی وجہ سے رانیں اور گھٹنے گھر کے مردوں کے سامنے بلکہ بڑے بڑے لڑکوں کے سامنے بھی (جن کو گھروں میں رکھنا حرام ہے) کھلے رہتے ہیں اس طرح سے گھر کے سب مرد و عورت مستحق لعنت ہوتے ہیں۔

ہماری قومی جد و جہد اور علماء

اجلاس ملتِ اسلامیہ اور اس کے علماء و مشائخ کی طرف سے ان کی خدمت میں مخلصانہ شکریہ پیش کرتا ہے۔ انکو اپنی محبت دلی ہمدردی اور عملی تائید کا یقین دلاتا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی عمران کی صحت ایمان وعزم میں برکت عطا فرمائے اور انکو ان کو زیادہ سے زیادہ ملتِ اسلامیہ کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے"[٢٣]

مولانا حسین احمد مدنی صاحب رح تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ باقی تمام حضرات پاکستان کے حامی تھے انھوں نے بذاتِ خود عملی طور پر تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور نہ ہی انھوں نے جناح (قائد اعظم) کو کافر سمجھا۔ اور نہ ہی" وہ جناح کے پیچھے سر جھکا کر چلنے پر مجبور ہوئے۔

---

[٢٣] پیغام شبیر احمد عثمانی۔ لاہور ١٩٤٦ء
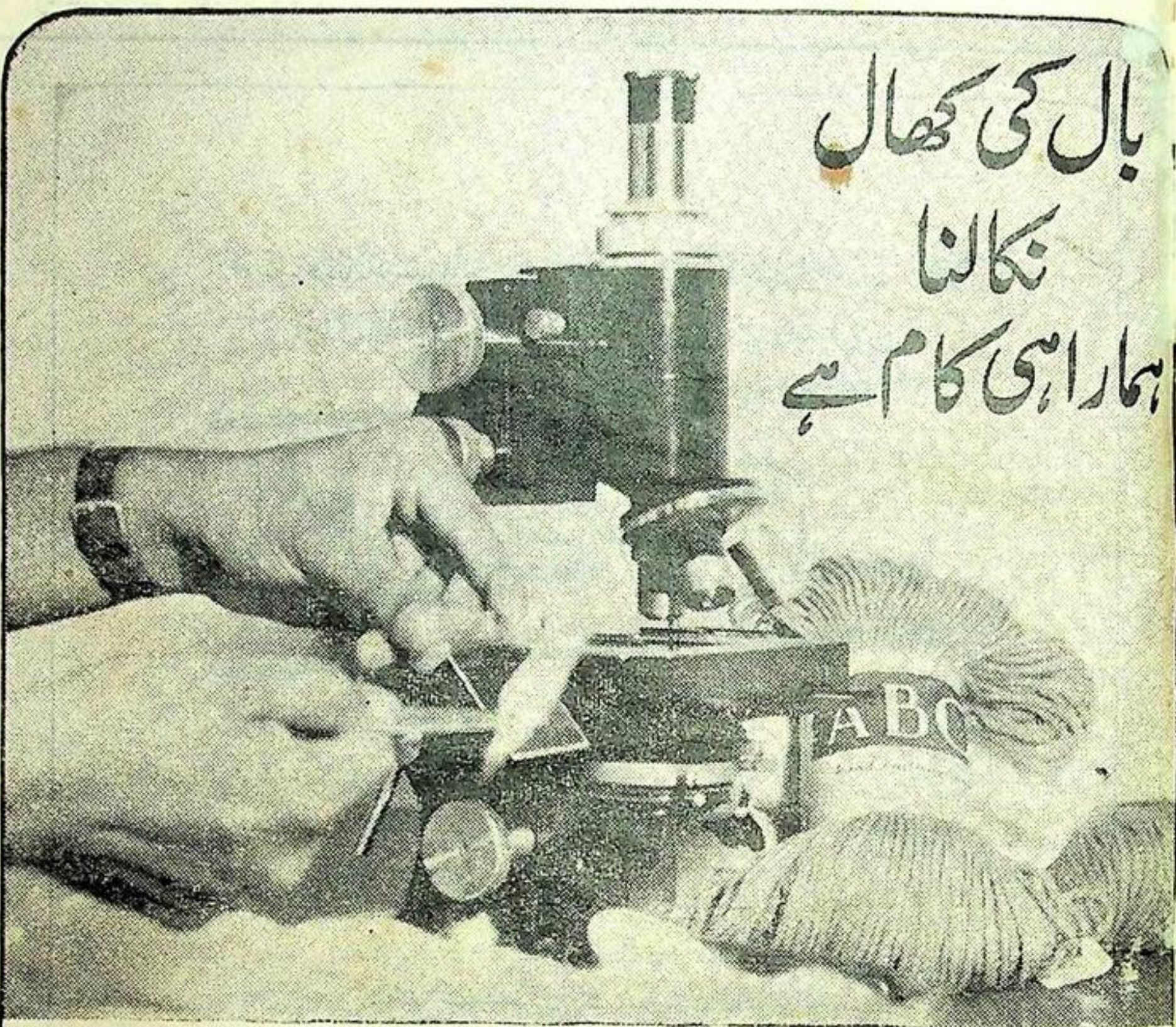
آج ہم وثوق سے
کہہ سکتے ہیں کہ
اے بی سی
سے بہتر کوئی
اُون نہیں

ہاتھ سے بننے کی اُون میں خوبی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ریشہ ایسی اُون کا ہو جس کا بال مہین و ملائم ہو ہماری کاوشوں کا آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اے بی سی اُون کے لئے ہم چھانٹ کر صرف وہ بال استعمال کرتے ہیں جس کا ریشہ ۲۳ مائکرون یعنی ایک انچ کے ایک ہزار ستاسیئویں ($\frac{1}{1087}$) حصہ سے زیادہ موٹا نہ ہو۔

اے بی سی اُون بہترین ریشہ سے **ثناء اللہ وولن ملز** کی جدید ترین جرمن مشینوں پر نئے تکنیک سے تیار کی جاتی ہے۔

ھ 457

بائبل سے قرآن تک

"اگر یہ کتاب دنیا میں پڑھی جاتی رہی تو مذہب یسوعی کی ترقی بند ہو جائے گی۔"
—— لندن ٹائمز

مولانا اکبر علی صاحب نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا
اور محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ نے
چار سال کی عرق ریزی کے بعد اسے تحقیق و تشریح کے
حسین سانچے میں ڈھالا ہے!

بائبل میں تحریف کے قطعی ثبوت —— عیسائیت کے عقائد پر بھرپور تنقید
قرآن کی حقانیت اور آنحضرتؐ کی رسالت پر ایمان افروز مباحث

شروع میں مدیر البلاغ کے قلم سے دو سو سے زائد صفحات کا تحقیقی مقدمہ جس میں عیسائیت کے بارے میں فیصلہ کن بحثیں کی گئی ہیں! ● تین جلدوں میں پندرہ سو صفحات!

پہلی جلد منظر عام پر آچکی ہے

مثالی کتابت و طباعت کے ساتھ ٦٢٠ صفحات ۔ قیمت حسین جلد کے ساتھ ١٥/- روپے

اس پتے سے منگایئے:

مکتبہ دار العلوم کراچی : ١٤

پبلشر: مفتی محمد شفیع دار العلوم کراچی نمبر ١٤
پرنٹر: مشہور پریس کراچی